خاورستان

افسر سیمابی احمد نگری

ناشر: افسر سیمابی احمد نگری

طابع: سرفراز قومی پریس لکھنؤ

سول ایجنسی: نگار بک ڈپو لکھنؤ

قیمت فی کاپی (جلد پارچہ) پانچ روپیہ آٹھ آنے

قیمت فی کاپی (جلد چرمی) سات روپیہ

بار اوّل اگست ۱۹۵۱ء

فہرس

سخنہائے گفتنی

(نیاز فتحپوری)

افسر سیمابی کے اس مجموعۂ کلام کی آپ صرف ورق گردانی کر ڈالیے اور غور سے نہ پڑھیے تو بھی آپ کو کم از کم یہ اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ افسر پڑھا لکھا شاعر ہے۔ جو کچھ کہتا ہے پامال طرزِ ادا سے ہٹ کر کہتا ہے۔ اس کے خیال میں سنجیدگی و عمق ہی مذاق کہنے والا ہے۔ اور۔ اسی کے ساتھ غالباً یہ خیال بھی قایم ہو گا کہ وہ کوئی پختہ عمر کا انسان ہے لیکن جب آپ کو یہ معلوم ہو گا کہ افسر کی عمر اس وقت صرف ۲۸ سال اور ان کی شاعری کی عمر ۱۲ سال کی ہے تو آپ کو تعجب ہو گا اور اس مشہور قول کی صحت کا قائل ہونا پڑے گا کہ "شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں"

افسر کا نام عبدالغفور ہے اور وطن احمد نگر۔ ان کے والد ماجد مولوی محمد اسمٰعیل خود بھی احمد نگر کے ارباب فضل و کمال میں سے تھے اور انھوں نے اپنی خاندانی روایات علم و ادب کو قائم رکھنے کے لئے افسر کی تعلیم میں بھی خاص اہتمام سے کام لیا لیکن افسر کی عمر ابھی ۱۵ سال کی تھی کہ وہ انتقال کر گئے اور اپنے ہونہار فرزند کے ادبی عروج کو نہ دیکھ سکے۔

والد کے انتقال کے بعد گو افسر کی تعلیم کا کوئی منظم سلسلہ باقی نہ رہ سکا لیکن فطرت کی طرف سے جو ذوق علم و ادب ان میں ودیعت ہوا تھا، اب اس نے ان کی رہبری

کی اور ان کو ایسے سنجیدہ لٹریچر کے مطالعہ کی طرف مائل کر دیا کہ غور و فکر ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی جن کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے جب انھوں نے شعراء حال کے کلام کا مطالعہ کیا تو اقبالؔ ہی پر جا کر ان کی نگاہ ٹھہری۔ اقبالؔ ہی کے کلام کو دیکھ کر ان کا ذوق آسودہ ہوا۔ اُردو شاعری میں اقبالؔ کی حیثیت ایک ایسے سنگِ میل کی سی ہے جس کو سبھی نظم گو شعراء نے اپنا نشانِ منزل قرار دیا، لیکن بعض تو راہ کی دشواری کو دیکھ کے معًا پیچھے ہٹ گئے بعض دو ایک قدم چلے اور واپس آئے اور بہت کم ایسے تھے جو ”شعلہ آہنگِ خونِ منصورم“ کہنے کا دعویٰ کر سکے۔

افسرؔ بھی انھیں ”شعلہ آہنگِ خوں منصورم“ کہنے والوں میں سے تھے اور اس میں شک نہیں کہ بڑے عزم و استقلال کے ساتھ وہ اب تک اسی وضع کو نباہتے چلے آ رہے ہیں۔ یوں تو افسرؔ کا ذوقِ شعری وراثتی چیز ہے کیونکہ ان کے دادا فقیر محمد تیغؔ اور چچا سلیمان خاں اوجؔ بھی احمد نگر کے خوش گو شعرا میں سے تھے لیکن افسرؔ کا وہ مخصوص ذوق جو ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے، غالبًا ان کی ذاتی و انفرادی چیز ہے، کیونکہ جب ۱۹۲۹ء میں انھوں نے اپنی شاعری کی ابتدا کی تو اس وقت بھی ان کی غزلوں کا رنگ یہ تھا۔

دُور ہے منزل اور اک حقیقت افسرؔ ۔۔۔ دل نہ ہنگامۂ باطل سے پریشاں ہو جائے

عرش سے لایا ہوں لے افسرؔ جنونِ تیز گام ۔۔۔ وسعتِ عالم بقدرِ یک فغاں ہے اور بس

یہ کلام اس وقت کا ہے جب افسرؔ کی عمر صرف ۱۶ سال کی تھی اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ فطرتًا نظم ہی لکھنے کے لئے پیدا ہوئے تھے اور غالبؔ یا اقبالؔ ہی میں سے کسی ایک کی راہ انھیں اختیار کرنا تھی۔

اقبالؔ نے انھیں کیوں متاثر کیا، اس کا تعلق غالبًا دو باتوں سے ہے، ایک افسرؔ

کی فطری دقت پسندی، دوسرے ان کا مفکرانہ احساس، اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے بڑی کامیابی سے اس اثر کو قبول کیا۔

اقبالؔ کے کلام کی تین خصوصیتیں بہت نمایاں ہیں، ندرتِ بیان، خیال کی گہرائی اور دردمندانہ لب و لہجہ اور انھیں تینوں خصوصیات کو سامنے رکھ کر افسرؔ نے نظمیں لکھنا شروع کیں، وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوئے اس کا اندازہ دشوار نہیں۔ کیوں کہ بعض جگہ وہ اقبالؔ سے اس قدر قریب ہو کر گزرے ہیں کہ امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً فلسفۂ خودی کے متعلق ان کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں :۔

خودی کی موت سے ہوتی ہے پرورش اس کی وہ اختلال گہ ہیں جس میں اُمتوں کے مزار
یہی ہے اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کہ تیری رُوح پہ طاری ہو نشّۂ کردار

اقبالؔ کے ایک شعر کی تضمین ملاحظہ ہو :۔

کل شاعرِ مشرق نے کہا خواب میں مجھ سے افسوس کہ مومن ہے غلامی پہ رضامند
ہر حال میں محکوم ہے، مغموم ہے معذور تدبیر سے خورسند نہ تقدیر سے خورسند
تو کشورِ انجم کی حکومت کا سزاوار کیوں تجھ پہ زمیں تنگ ہے اے مردِ ہنرمند
غمگیں نہ ہو پژمردگیٔ لالہ و گل سے تخریب ہے اس دہر میں تعمیر کے مانند

"معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز" [1]

خود شناسی کے عنوان سے ان کی ایک نظم کے بعض اشعار دیکھیے :۔

نگاہِ شوق میں ہے جلوہ خانۂ جبریل یہ دشتِ سادہ کی پہنائی و ہجومِ تخیل

---

[1] پوری نظم صفحہ ۱۶۹ پر درج ہے

چمن میں لالہ و گل نے ہزار رُخ بدلے — ہنوز مقصدِ فطرت ہے تشنۂ تکمیل

وہ سرفروش مجاہد ہے بندۂ مومن — لئے ہوئے ہے جو عشقِ خودی کی تیغِ اصیل [1]

مجاہد کے عنوان سے انھوں نے ایک نظم لکھی ہے جس میں رُوح و زبان دونوں اقبال کی ہیں :-

مجاہد نام ہے اے دوست اس انسانِ کامل کا
مٹا دیتا ہے جو اک وار میں ہر نقشِ باطل کا
سکھاتا ہے جو گردِ راہ کو اسرارِ الوندی
جو اپنے خون سے کرتا ہے لالہ کی حنا بندی
مجاہد بے خطر ہوتا ہے مرگِ ناگہانی سے
مجاہد غسل کر سکتا ہے تلواروں کے پانی سے

الغرض افسر کا اقبال کے فلسفہ، اقبال کی زبان اور اقبال کے انداز بیان سے متاثر ہونا ان کی اکثر نظموں سے ظاہر ہے لیکن یہ خیال کرنا کہ انھوں نے اس رنگ سے ہٹ کر کوئی نظم نہیں لکھی درست نہ ہوگا، کیونکہ علاوہ خالص ادبی رنگ کی نظموں کے بعض میں انھوں نے ان مسائل پر بھی اظہار خیال کیا ہے جو اقبال کے زمانہ میں زیر بحث نہ تھے اور پوری قوت کے ساتھ ان پر رائے زنی کی ہے۔

ہندوستان کے آثارِ آزادی کو دیکھ کر جب وہ بے اختیار ہو جاتے ہیں تو ان کے لحن کی دلکشی کا انداز یہ ہوتا ہے۔

چمن کی خاک پہ مصروفِ رقصِ پیہم ہے — تمامِ جوششِ بہاراں تمام سیلِ نمو

---

[1] پوری نظم صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ ہو

اُبل رہے ہیں سرودِ خودی کے فوارے — چھلک رہے ہیں نشاطِ خود آگہی کے سبو
چمک رہا ہے فضا میں خلوص کا پرچم — بسی ہوئی ہے فضا میں حیات کی خوشبو
وہ راگ چھیڑ گئی ہے نسیمِ نرم خرام — کہ شعلہ زن ہے رگِ خار و خس میں ذوقِ نمو

تمام طوق و سلاسل پگھلنے والے ہیں

یا مہاتما گاندھی کی موت پر جو نظم انھوں نے لکھی ہے اس کے خلوص و صداقت کو ملاحظہ فرمائیے

یہ جبر و قہر کے بندے یہ شور و شر کے غلام — نہ پاسکیں گے تری زندگی کا رمزِ دوام
دیا ہے صلح و مساوات کا سبق تو نے — عطا کیا ہے جنوں کو نیا اُفق تو نے
وفا کے راگ، محبت کی آگ لے کے گیا — تو اپنے ساتھ وطن کا سہاگ لے کے گیا

سیاسیات و قومیات سے ہٹ کر بھی اُنھوں نے بعض نظمیں کہی ہیں جن میں ہلکی سی کیفیت تغزل کی پائی جاتی ہے لیکن مفکرانہ روح سے وہ بھی خالی نہیں

مثلاً سموم و نسیم کی نظم ملاحظہ ہو جس میں نسیم کی تعبیر اس طرح کی گئی ہے:۔

ہے یہ پیغمبرِ فطرت اسے کہتے ہیں نسیم — اس کی چھاگل سے ٹپکتی ہے نبیذِ تسنیم
یاسمین و سمن و سنبل و ریحاں اس کے — ہر طرف عطر فشاں گیسوئے پیچاں اس کے
رقص کرتی ہے فضاؤں میں ترنم بن کر — دوڑ جاتی ہے لبِ گل پہ تبسم بن کر
اس کی ہر موج میں پیغام خود افروزی ہے — حور کے گیت کی شیرینی و دلسوزی ہے

اب اس کے مقابلہ میں سموم کی کیفیت ملاحظہ ہو:۔

ہے یہ تاراج گرِ انجمنِ سرو و سمن — چاٹ جاتی ہے شگوفوں کو یہ اندھی ناگن
اس کی ہر سانس نقیب آگ کے طوفانوں کی — ملکہ ہے یہ بھڑکتے ہوئے ویرانوں کی

افسر کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا محتاط شاعر ہے بہت سنبھل کر

سوچ سمجھ کر کہتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے پہلے ہر ہر لفظ پر غور کر لیا ہے اور
پھر اس کا انتخاب کیا ہے

ندرتِ بیان اور جدتِ تشبیہہ شاعری کی جان ہے لیکن بعض شعراء میں اس کا
غلو اس حد تک پایا جاتا ہے کہ وہ صحت الفاظ، صحتِ تراکیب اور زبان و محاورہ کی
خوبیوں کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں۔ افسر کا کلام اس عیب سے بالکل پاک ہے۔
وہ کوشش کرتے ہیں کہ لغوی حیثیت سے کوئی غلط لفظ ان کے قلم سے نہ نکل جائے
کوئی ایسی فارسی ترکیب استعمال نہ کریں، جو بے معنی یا بے محل ہو، اور تشبیہات میں ندرت پیدا
کرنے کے باوجود وہ حقایق کو نظر انداز نہیں کرتے، یہ تو ہوئیں ظاہری خصوصیات جن کا
آج کل بہت کم خیال رکھا جاتا ہے، اب رہیں معنوی خصوصیات، سو میں سمجھتا ہوں کہ یہ
زیادہ وزنی و گرانقدر ہیں۔

افسر کے یہاں باوجود اس کے کہ وہ نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، آزادی کا مفہوم
مذہب و اخلاق سے روگردانی نہیں ہے بلکہ اسے ترقیِ انسانیت اور بقارِ اجتماعیت کا ضروری
جزو خیال کرتے ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اسے ملا یانہ تقشف و فرسودگی سے علیحدہ
رکھ کر صرف کردار و عمل پر زور دیتے ہیں جو اصلی روح ہے مذہب کی۔
ایسی نظموں میں جو جوش و ولولہ ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے وہ نتیجہ ہے اُن کے
خلوص و صداقت کا اور ایک ایسی سچی دردمندی کا جس کا تعلق احساس سے نہیں بلکہ
کربِ احساس سے ہے۔ اپنی نظم دشتِ کربلا میں وہ شہادتِ حسینؑ پر گریہ و زاری نہیں
کرتے بلکہ اس کو کردار و عمل کا ایک پیغام قرار دیتے ہیں اور اس کی اہمیت کو اس طرح
ظاہر کرتے ہیں :-

کسی خیال میں کھویا ہوا یہ ویرانہ — سنا رہا ہے یقین و عمل کا افسانہ
متاعِ زیست بس اک سوزِ اندروں ہے یہاں — غرورِ افسر و اورنگ سرنگوں ہے یہاں
یہاں خرد کو ہے احساس ناتمامی کا — گدازِ عشق ہے عنوان تشنہ کامی کا
یہ انجمن ہے جواں سال آفتابوں کی — رُکی رُکی ہے یہاں نبض انقلابوں کی
یہاں ہے رعشہ بر اندام نازِ حشمت و جاہ — ازل سے تا بہ ابد لا الٰہ الا اللہ

جمالِ عشق سے پردے اُٹھائے جائیں گے
یہاں کی خاک سے انساں بنائے جائیں گے

پانچویں اور چھٹے شعر کو دیکھئے ممکن نہیں کہ بغیر دل کی آواز اور روح کے احساس کے قلم سے نکل جاتے۔

عام شعراء کی طرح افسر بھی جذبۂ عشق سے خالی نہیں لیکن ان کے یہاں فلسفۂ عشق محبت بہت بلند ہے، اس میں مادیت کم اور معنویت بہت زیادہ ہے، عشق ان کے یہاں خون کا وہ ہیجان نہیں جو صرف جذبۂ جنسی سے تعلق رکھتا ہے، بلکہ وہ ایک نہایت بلند لطیف احساس ہے جو مادیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ یکسر وجدانی طہارت و پاکیزگی ہے کہتے ہیں :-

عشق نورِ زندگی ہے، عشق نارِ زندگی — نور و نارِ زندگی پروردگارِ زندگی
ہے متاعِ عشق صرف اک آرزوئے ناصبور — جلوہ زارِ عشق آبادی کے ہنگاموں سے دور
چاند کا نغمہ، ستاروں کا ترنم، بوئے گل — عشق ہی دارائے عالم عشق ہے مولائے کل
تیتری کا رقص، پروانے کا اندازِ جنوں — آبجو کا گیت، کوئل کے ترانوں کا فسوں
عشقِ فصلِ گل فشانی، عشقِ ابرِ نوبہار — وقت کی پرواز، ہیرے کا جگر، خنجر کی دھار

مانگتے ہیں بارگاہِ عیش سے عیش ازل — شام کے سینے میں دھندلکے صبح کے تازہ کنول

ان چند اشعار کے بعد خیال کا عروج شروع ہوتا ہے:

عشق کا سیلِ تجلیات ہے آدم فروز — ساز کی آواز میں دہکی ہوئی اک موجِ سوز

عشق ہے تیغِ محمدؐ عشق ہے چوبِ کلیمؑ — عشق یزدانی لبوں کا اک تبسم ہے ندیم

عشق ذوقِ تازہ کاری، عشق پیکارِ حیات — بے سرورِ عشق انساں باربردارِ حیات

کہیں کہیں انھوں نے محبت کی کیفیت کو صرف محاکاتی احساس تک محدود رکھا ہے لیکن ایسی نظموں میں بھی وہ عام روش اختیار نہیں کرتے بلکہ بہت بلند شاعرانہ تعبیرات سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً فراق کا مفہوم ان کے نقطۂ نظر سے ملاحظہ فرمائیے:-

وادیٔ کوہ و جوئبار خموش — دشت خاموش، لالہ زار خموش

چاندنی رنگ و نور سے عاری — ماہ و انجم پہ بیخودی طاری

بیقراری سی ابر پاروں میں — جان باقی نہیں ستاروں میں

یہ سکوتِ سپہرِ مینائی

روح فرسا ہے شامِ تنہائی

اس میں شک نہیں کہ افسر نے اپنے اندازِ فکر اور اسلوب بیان کے لحاظ سے اس وقت کے تمام نوجوان شعرا میں اپنا ایک مقام علیحدہ پیدا کر لیا ہے جس پر ان کو فخر کرنا چاہیئے۔ میں ان کے مستقبل کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا، کیونکہ انھوں نے ابتدا ہی میں انتہا کے منازل طے کر لئے ہیں لیکن ہاں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ اگر انھوں نے اس جادہ سے قدم نہ ہٹایا (اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایسا کریں) تو ایک وقت ایسا آئے گا جب ان کے کلام کی اثر آفرینی کا تعلق الفاظ سے ہٹ کر صرف جذبات تک رہ جائے گا اور یہی ہی شاعری کا صحیح مقصود

خاورستان

زطبعِ آتشینم بر فروزم آذرستانے
زداغِ لالۂ دل می چکانم خاورستانے

افسر سیمابی، احمد نگری

پہلے یہ اغلاط درست کر لیجئے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۸	۳	ننّی	مغنّی	۱۳۹	۹	نظریہ	نظر یہ ہے
۳۲	۶	سرود	سرو وسمن	〃	۱۰	ہے وادی	ہے یہ وادی
۴۹	۵	ہم	سم	۱۷۱	۶	تا محرم	نامحرم
۶۴	۴	خارِزار	خارزار	۱۷۴	۶	لے جام مے	لے جامرے
۶۶	۷	حود چیخ اپنی	خود چیخ اپنی	۲۱۰	۳	آسیں	آستیں
۸۰	۱۲	رہرنوں	رہزنوں	〃	۱۰	نشر	نشتر
۸۴	۳	فیصلہ	فیصلہ	۲۲۶	۶	روشی	روشنی
۸۵	۳	امن ادراک	امن وادراک	۲۵۰	۸	تیع	تیغ
〃	۱۱	حب	جب	۲۷۲	۶	کھوگے	کھوگئے
۸۷	۳	رام	دام	۲۹۲	۶	ہر ہر	ہر
〃	۹	خراں	خزاں	۳۱۲	۱۲	پھلیے	پھیلے
۸۹	۸	ہر	پر	۳۱۷	۸	مری	وہ
۱۰۰	۶	یقین	یقیں	۳۲۷	۹	رنگ دصوت	رنگ وصوت

صبحِ مراد

صد شکر کہ آج گلستاں سے
رخصت ہے خزاں کا دورِ منحوس
پھر وہم و گماں کی تیرگی میں
ضو ریز ہوئے یقیں کے فانوس
کونین فدائے چشمِ ساقی
کچھ بھی نہیں عزّ و جاہِ کاؤس
قسمت نہیں آج ہم سے ناراض
آہیں نہیں آج اثر سے مایوس
قمری سے ہے سرو ہمکنار آج
کانٹوں سے ہیں آج پھول مانوس
نرگس نہیں آج آب دیدہ
خوشبو نہیں آج گل میں محبوس

مطلق نہیں خوفِ محتسب کا
مغرور ہے آج شیخِ سالوس
یہ عہد ہے عہدِ بادہ خواری
یہ فصل ہے فصلِ چنگ و طاؤس
لُٹ جائے متاعِ دین و دانش!
کھل جائے فریبِ ننگ و ناموس!
ہاں مے سے کوئی رہے نہ محروم!
ہاں لوٹ نہ جائے کوئی مایوس!
ہیں مور چمن میں رقص فرما!
ہر ایک روش ہے تختِ طاؤس
اللہ یہ دل کی بےقراری
ہر سانس ہے بجلیوں سے ملبوس
انسانیت آج گا رہی ہے!
خاموش رہیں اذان و ناقوس!

عصرِ نو

آب و گل نے بارہا کھائی ہے دوزخ کی قسم
خون برساتا رہا ہے خاک پر ابرِ کرم
بارہا آئی قیامت بجلیوں کے ہم رکاب
مضمحل انسانیت نے آج دیکھا ہے یہ خواب

خندہ زن ہے ابنِ آدم فطرتِ چالاک پر
برق پارے ہیں چھڑکتے ہیں بساطِ خاک پر
ہو گیا ہے نور سے معمور سینائے حیات
طور پر اب عکس افگن ہے تجلائے حیات
زندگی کھوئی ہوئی ہے بارشِ انوار میں
نغمہ خواں ہے عشق و مستی کے ترنم زار میں

آرہا ہے اپنے مرکز پر شبابِ کائنات
مل چکی ہے سنگ و آہن سے زمانے کو نجات
ہر نفس ہے رنگ و بو کی داستاں کہتا ہوا
ہو چلا ہے خشک راہوں پر لہو بہتا ہوا
آج ہر سو دَور میں ہے بادۂ آئینہ فام
آج خوں آشام تلواریں ہیں روپوشِ نیام
ماہِ نو سے جگمگا اُٹھنے کو ہیں راتیں نئی
آفتابِ عصرِ نو لایا ہے سوغاتیں نئی
آرہی ہے برق پیکر صبح کے نزدیک رات
روشنی منھ پر ملے گی یاس کی تاریک رات
زندگی بیتاب ہے ذوقِ فراواں کے لئے
بن رہی ہے اک نئی فردوس انساں کے لئے!

ہ

خانہ بدوش

شاخوں پہ سُرخ و زرد شگوفے ہیں محوِ خواب
خوابِ گراں سے جاگنے والا ہے آفتاب
گیسو کھلے ہوئے ہیں عروسِ بہار کے
شانے ہلا رہی ہے صبا لالہ زار کے
ویران ہو چلی ہے ستاروں کی انجمن
دامانِ کوہسار میں جیسی ہیں خیمہ زن
وہ لوگ پیکرِ غم و حرماں کہیں جنھیں
بیتابیوں کے روپ میں انساں کہیں جنھیں
ہر سانس ایک محشرِ پنہاں لئے ہوئے
بیداریاں بھی خوابِ پریشاں لئے ہوئے

انبارِ آرزو سے تنفس رُکا ہوا

افراطِ غم سے روح کا پرچم جھکا ہوا

نَورس کنول سمومِ اجل کی پناہ میں

بے جان حسرتوں کے تلاطم نگاہ میں

سینوں میں دل کشاکشِ ہستی سے داغ داغ

انسانیت کی قبر کے بجھتے ہوئے چراغ

ہونٹوں پہ آہِ سرد جبیں پر غبارِ راہ

ہیں اس زمیں پہ خاک بسر کتنے مہر و ماہ!

ادراک

وہ میری رُوح کا مقصود و فخرِ موجودات
اُسی کے نور سے روشن ہے جلوہ گاہِ صفات

سکھا رہی ہے خرد تجھ کو فنِ شیشہ گری
عجب نہیں جو پریشاں ہو کاروبارِ حیات

ہر ایک ذرّے میں ہیں لاکھ بجلیاں اے دوست
نگاہِ شوق نہ ہو جائے مرکزِ آفات

سُن اے فریفتۂ قصّہ ہائے ہجر و وصال
عمیق تر ہیں سمندر سے زندگی کے نکات

خودی میں ڈوب کے ہنگامہ آزما ہو جا
خودی نہ ہو تو نہ سوزِ یقیں نہ سوزِ حیات

مری نگاہ خرافاتِ مادّی پہ نہیں
خرد ہے پست حقیقت ہے ارفع الدرجات
نظر ملا کہ بتاؤں یہ زندگی کیا ہے
نہ ہو خمار تو بڑھتا نہیں مذاقِ حیات
زمینِ شور میں باغِ حیات کر تعمیر
یقین و عزم سے حاصل ہے آدمی کو ثبات
سکونِ دیدۂ تشنہ ہیں موجہائے سراب
خدا کرے کہ نہ ٹوٹے طلسمِ لات و منات!

سخت ہیجان میں ہیں شمس و قمر
پیکرِ خاک کی برنائی دیکھ

تو نے چھانی ہیں سمندر کی تہیں
کبھی قطرے کی بھی گہرائی دیکھ

کس تب و تاب سے آئی ہے خزاں
غنچہ غنچہ ہے تماشائی دیکھ

سُن محبت کی فسوں کار آواز
پھر اس آواز کی گیرائی دیکھ!

سوزِ خوابیدہ

یہی معراجِ آدم ہے، یہی مومن کی شمشیریں
یقین و عزم پیدا کر بدل جائیں گی تقدیریں

حریمِ کبریا تک ہے رسائی میری نظروں کی
حدیں کیا ہیں ترے ذوقِ نظر کی؟ چند تصویریں!

یہی نکتہ حدیثِ جذب و مستی کا خلاصہ ہے
کہ میں جب آہ کرتا ہوں تڑپ جاتی ہیں تاثیریں

شبِ تاریک سے ہوتے ہیں انوارِ سحر پیدا
کواکب کا لہو ٹپکے اگر سورج کا دل چیریں

اسیرانِ قفس پھر کر رہے ہیں سعیِ آزادی
بنیں گی آہنِ زنجیر سے خوں بار شمشیریں

مرے نغموں سے آخر جاگ اُٹھا سوزِ خوابیدہ
فلک پر گونجتی ہیں آج محکوموں کی تکبیریں

بہاروں پر حکومت کر، ستاروں پر حکومت کر
کہ یہ ارض و سما ہیں بندۂ مومن کی جاگیریں

عجب کیا گر نہیں تجھ پر اثر میری نواؤں کا
ہیں تیری فہم سے بالا کتابِ دل کی تفسیریں

جب آتا ہے غلاموں کے لہو میں جوش اے افسرؔ!
چمکتی ہیں مثالِ برق زنگ آلودہ شمشیریں!

سودِ عمل

نویدِ عزم و عمل، مژدۂ مذاقِ نمود
بدل رہا ہے خرد کا نظامِ زنگ آلود
سُراغِ جادۂ ہستی ہے گردِ راہ گزار
اگر نگاہ سے اوجھل ہو منزلِ مقصود
مآلِ غنچہ و گل ناگزیر ہے ــــــ لیکن
غمیں نہ ہو کہ خزاں کا بہانہ ہے مقصود
خدا بچائے کہ مغرب کے خارزاروں میں
سجا رہی ہے خرد بزمِ نادر و نمرود
خراب و خستہ رہی ہے ازل سے "تا امروز"
وہ قوم جس پہ مسلط رہی بلائے جمود

مجھے یہ ڈر ہے نہ کھو جائے کاروانِ حیات

قدم قدم پہ فراز اور راستہ مسدود

خرد کی آگ نہیں لالہ زارِ ابراہیم

اس آستیں میں ابھی بت ہیں سیکڑوں موجود

زبانِ اہلِ حقیقت کہیں نہیں رُکتی

ہجومِ دار و رسن ہو کہ آتشِ نمرود

نہ ترجمانِ شبانی نہ رازدانِ شعیب

مری نوائے پریشاں ہے زندگی کا سُرود!

عرفان

شعلہ زن ان کے لہو میں ہے جلالِ محمودؔ
آج تک جو تہِ محراب رہے وقفِ سجود
اے کہ معلوم نہیں تجھ کو خودی کا مقصود
آتشیں عزم سے ہے معرکۂ بود و نبود
عشق و مستی ہمہ تن دبدبہ ہائے محمودؔ
پاک ہے اسود و احمر سے شبستانِ وجود
زندگی جس سے لرزتی ہے خلیل اللّٰہی
ہو خرابِ ظن و تخمیں تو ہے نارِ نمرودؔ
مجھ سے نومیدیٔ نظارۂ انوار نہ پوچھ
اب مرا جذبِ دروں بھی ہے پشیمانِ نمود

ایک تصویر کے دو رُخ ہیں جلال اور جمال -
وہی گلزارِ خلیل اور وہی نارِ نمرود

تو ہے نامحرمِ تاب و تپِ باطن — ورنہ
تیری آہوں سے پگھل جائے ستاروں کا وجود

سینۂ لالہ ہو یا آئینہ زارِ شبنم
ڈھونڈ لیتی ہے نظر جلوہ گہہِ لاموجود

ایک ہنگامۂ عرفان و تجسس کے بغیر
زیست بیکار، یقیں خام، نمازیں بے سود!

افسر سیمابی

مشاہدات

ہو گئیں ویران عرفان و یقیں کی جنتیں
خلد زارِ ہند کو دوزخ نشاں پاتا ہوں میں

فطرتِ ہستی! کوئی صحرائے نو ایجاد کر
وسعتِ عالم بقدرِ یک فغاں پاتا ہوں میں

چل گیا فکر و نظر پر مادیت کا فریب
آدمی کو موت کی جانب رواں پاتا ہوں میں

راہزن پہنے ہوئے ہیں اب لباسِ رہبری
نور کے سائے میں ظلمت کو جواں پاتا ہوں میں

مرحبا اے آتشِ دل! آفریں اے سوزِ عشق!
ہر نفس میں اک حیاتِ جاوداں پاتا ہوں میں

باطنِ ظلمت میں ہیں سورج کی کرنیں بے قرار
رات کو ہنگامہ پیرائے سحر پاتا ہوں میں

فاش کر دیتا ہے اک نغمۂ نَی کا مقام
آئینے میں جوہرِ آئینہ گر پاتا ہوں مَیں

رنگ محلوں میں غزل خواں ہیں امیرانِ کبار
خاک برِ فاقہ کشوں کو نوحہ گر پاتا ہوں مَیں

کوئی چاندی کا پجاری، کوئی سونے کا غلام
آدمیت کو اسیرِ سیم و زر پاتا ہوں مَیں

تلخ تھی میرے لئے کل تک شرابِ زندگی
اب شرابِ زندگی کو تلخ تر پاتا ہوں مَیں!

عرش صحرائی

یقین و عزمِ شباب و سرور رعنائی
حریمِ فقر مقامِ شکوہِ دارائی

کمالِ ذکر و خبر یوسفی، زلیخائی
دبالِ فکر و نظر خواجگی و لالائی

فسادِ چشمِ غلط بیں ہے اعترافِ شکست
وگرنہ ہو دلِ ہر خار عرشِ صحرائی

خرد کا نام ہے دردِ جگر سے محرومی
جنوں زبونیِ ادراک ہو تو رسوائی

اسیرِ دانشِ حاضر ہے بندۂ مومن
فغاں کہ مجھ کو گوارا نہیں یہ رسوائی

مری نگاہ میں انجامِ لالہ و شبنم
ترے دماغ میں آغازِ صبحِ رعنائی

عطا ہوا مجھے سوزِ نظر وراں۔ لیکن
تری خودی میں نہیں ذوقِ شعلہ پیدائی!

نقشِ نوی

یہ شوخ و شنگ ستارے، یہ موجہ ہائے نسیم
مری نگاہ میں ہے جلوۂ جدید و قدیم

اگرچہ میں ہوں مثالِ زمانہ گرمِ سفر
ستا رہی ہے مجھے یادِ ہمرہانِ قدیم

رگِ حیات کی لرزش کو تیز کرتی ہے
نگاہِ شوق کہ ہے حکمرانِ ہفت اقلیم

جمالِ حسن میں باقی نہ سوز ہے نہ گداز
جلالِ عشق ہے محوِ تلاشِ ضربِ کلیم

تری نظر سے نہاں ہے مقامِ شوق، کہ تو
نہیں ہے گوش بر آہنگِ سازِ قلبِ سلیم

۲۱

خودی میں ڈوب دلِ تازہ کار پیدا کر
حدیثِ خفتہ دلاں قصۂ جدید و قدیم

مَیں تیری کہنہ پرستی سے ہوں بہت بیزار
کہ میرے نقشِ نوی میں نہیں ہے رنگِ قدیم

عجیب چیز ہے ساقی خودی کا پیمانہ
یہی ہے میرے لئے جامِ کوثر و تسنیم

سرور روح میں باقی نہ کیف ایماں میں
دوبارہ زندہ نہ ہو جائے سحرِ عہدِ قدیم!

خود شناسی

نگاہِ شوق میں ہے جلوہ خانۂ جبریل
یہ دشتِ سادہ کی پہنائی و ہجومِ تخیل

تری نوائے پریشاں ہے صورِ اسرافیل
کہ تُو ہے راہ روِ جادۂ کلیم و خلیل

ڈرا رہی ہے تجھے تیرگیٔ شامِ سفر
اندھیری رات کا تارا نہیں تری قندیل

چمن میں لالہ و گل نے ہزار رُخ بدلے
ہنوز مقصدِ فطرت ہے تشنۂ تکمیل

اگر تو اپنی حقیقت سے آشنا ہو جائے
ہیں تیرے بحر کی موجیں فراتؔ و دجلہؔ و نیلؔ

تری خودی میں ہے فردوس گم شدہ کا سُراغ
عطا ہوا تجھے صبر حسینؑ و صدقِ خلیل

رُخِ ہوائے زمانہ پہ گام فرسا ہو
تری نگاہ سے پوشیدہ ہے نشاطِ رحیل

وہ سرفروش مجاہد ہے بندۂ مومن
لئے ہوئے ہے جو عشق و خودی کی تیغِ اصیل

کبھی دماغ میں گونجا ہوا ترانۂ رزم
کبھی زباں پہ رسولِ خدا کا ذکرِ جمیل!

خونِ تمنّا

جل چکی شاخِ نشیمن، تھم چکی بادِ سموم
اب ہوائے نو بہاراں گوہر افشاں ہے تو کیا

کر چکی خونِ تمنّا تیرگیٔ شامِ غم
آسماں پر اب نیا سورج درخشاں ہے تو کیا

جام افسردہ، صراحی سرنگوں، مینا خموش
مے کدے میں اب ہجومِ میگساراں ہے تو کیا

دور ہو سکتا نہیں اے دوست قرنوں کا سکوت
زندگی اب اپنے بربطِ پر غزل خواں ہے تو کیا

گردشِ دوراں پہ کوئی فتح پا سکتا نہیں
تیرے لب پر شکوۂ آلامِ دوراں ہے تو کیا

منکشف ہونے کو ہے رازِ ثباتِ جاوداں
آج اگر شیرازۂ ہستی پریشاں ہے تو کیا
کل یہ دنیا داد دی رقص و نوا کھلائے گی
آج اگر جولانگہِ سیلابِ طوفاں ہے تو کیا
سڑ چکے اس کے عناصر مٹ چکا سوزِ حیات
اب تجھے فکرِ علاجِ دردِ انساں ہے تو کیا
زندگی کی تلخیوں نے چھین لی تابِ نظر
طور کی چوٹی پہ راکھ سراب چراغاں ہے تو کیا!

نوائے عشق

حیاتِ مردِ مومن جاودانہ
زمانہ کچھ نہیں! کیسا ہے زمانہ!

دیا تو نے وہ سوزِ عارفانہ
مرا ہر لفظ ہے پیغمبرانہ!

بیادِ فصلِ گل کوئی ترانہ!
اُٹھا ساغر کہ ہستی ہے فسانہ!

جو ہے راز آشنائے مستیِ شوق
بنا سکتا ہے آپ اپنا زمانہ!

یہاں کوئی نہیں ہے محرمِ دوست
مگر میری نوائے عاشقانہ!

جبینِ شوق کی عظمت نہ پوچھو
قدم لیتا ہے خود ہی آستانہ!

ہزاروں بار دُہرایا گیا ہے
جمالِ عشق و مستی کا فسانہ

دوامی ہے مری شانِ فقیری
حباب آسا شکوہِ خسروانہ!

فضاؤں میں اُڑا پھرتا ہے شاہیں
کبوتر کا جہاں دیوارِ خانہ!

نہیں میں کشتۂ زہدِ ریائی
مجو از من نمازِ پنجگانہ!

مجھے ڈر ہے زمانے کی روش سے
نہ ہو جائے حقیقت بھی فسانہ!

پہاڑوں کو بنا دیتی ہے رائی
محبت کی نگاہِ جادوانہ!

جسے برقِ تپاں کہتے ہیں افسرؔ
وہ ہے دراصل شاخِ آشیانہ!

داغِ نارسائی

کب تک یہ جنونِ خود نمائی ہر دل میں ہے داغِ نارسائی
اس دور میں ہو گئی ہے نابود صدق اور صفا کی روشنائی
تاریک ہے پھر ضمیرِ آدم دے مجھ کو مجالِ دل کشائی
مانا کہ ہے وصل جنّتِ دل پھر بھی ہے عزیز تر جدائی
شاہیں کی نگاہ میں ہے مہمل قمری کی حدیثِ دل رُبائی
کشتی کہیں غرق ہو نہ جائے تاچند ہوائے ناخدائی!
پُر خار ہے باغِ محبت پھر یہ تیری برہنہ پائی!
یارانِ حرم سے کوئی کہہ دے بیکار ہے سجدۂ ریائی!

انساں ہے ذلیل و خوار افسر
ابلیس کی آرزو بر آئی!

جہاں میں ہوں

وہاں اے ہمنشیں! غم اور فقط غم ہے جہاں میں ہوں
ہر انساں نوحہ خواں، ہر آنکھ پُرنم ہے جہاں میں ہوں

غریبوں کے لہو سے ہے زر افشاں تاجِ سلطانی
وہاں پیمانۂ خوں ساغرِ جسم ہے جہاں میں ہوں

پسِ نورِ سحر تاریک راتیں رقص کرتی ہیں
مسرت اک ترقی یافتہ غم ہے جہاں میں ہوں

خدا سویا ہے اور سوتا رہے گا صبحِ محشر تک
وہ دنیا اک "طلسماتِ منظم" ہے جہاں میں ہوں

گلوں کی نکہت افشانی نہ شبنم کی دل افروزی
خزاں کا دور ہے شعلوں کا موسم ہے جہاں میں ہوں

محبّت اپنے حجلے سے کبھی باہر نہیں آتی
کہ آدم دشمنِ فرزندِ آدم ہے جہاں میں ہوں

غبار آلود رہتا ہے مہ و خورشید کا ہر جسم
وہاں ظلمت زیادہ، روشنی کم ہے جہاں میں ہوں

ہلاکِ تشنگی ہیں یاسمن کی نوجواں کلیاں
مگر ہر خار کے دامن میں شبنم ہے جہاں میں ہوں

کوئی محرم نہیں اسرارِ آزادی کا اے اختر
غلامی سے وہاں اک ربطِ محکم ہے جہاں میں ہوں!

کربلائے عصر

باقی ہے شعلہ کاری دار و رسن ابھی
تجھ کو سنائے کون حدیثِ چمن ابھی
بھیگی ہوئی ہے خون میں ارضِ وطن ابھی
بے آبرو ہے وادیٔ گنگ و جمن ابھی
تاریک سا ہے عالمِ احساس و آرزو
موہوم سی ہے مہر و وفا کی کرن ابھی
ٹوٹے پڑے ہیں حسن و صداقت کے آئینے
ہے گیسوئے حیات شکن در شکن ابھی
محروم رنگ و بو سے ہے ماحولِ رنگ و بو
ہے تشنۂ قدومِ بہاراں چمن ابھی

لہرا رہا ہے پرچمِ تخریبِ کائنات
برپا ہے ایک محشرِ گور و کفن ابھی

ہر پھول اک مجاورِ ماتم فروش ہے
گونجا ہوا ہے شورِ فغاں سے چمن ابھی

سہمی ہوئی ہیں جورِ خزاں سے لطافتیں
ہے ناتمام جلوۂ سرو و سمن ابھی

آمادۂ ظہور ہے اک روزگارِ نَو
ہے روحِ زندگی کا وہی پیرہن ابھی

غلطیدہ خون و خاک میں ہیں کتنے حق پرست
ہے کربلائے عصر سوادِ وطن ابھی

وہ بجلیوں کا رقصِ مسلسل نہیں تو کیا
افسر! اک آگ سی ہے محیطِ چمن ابھی!

صبحِ وطن

جاگ اُٹھی خوابِ گراں سے رُوحِ شیخ و برہمن

مرحبا صبحِ وطن! صد مرحبا صبحِ وطن

دے رہی ہے مجھ کو دنیا کیوں رہائی کی نوید

دیکھ لیتا ہوں تصوّر ہی میں تصویرِ چمن

جاں بلب ہے شمعِ سوزاں ماہ پارے سو گئے

ہو یہاں اب کون "افسانہ فروزِ انجمن"

پھر کوئی منصور شاید باطنِ فطرت میں ہے

ہو رہا ہے اہتمامِ "دعوتِ دار و رسن"

انتشارِ رنگ و بو میں کھو گئی خود فصلِ گل

کون کر سکتا ہے اب درمانِ آشوبِ چمن

پھر پریشاں ہو رہا ہے گیسوئے گنگ و جمن

ہر قدم پہ درسِ عبرت! بے بسی ہر موڑ پر!
منزلِ ہستی کی راہیں کس قدر ہیں پُرشکن!

ہیں بطونِ صبح میں کتنے ستاروں کے مزار
خون میں بھیگی ہوئی پاتا ہوں سورج کی کرن

اِس کے غنچوں کو دیا ہے میں نے پیغامِ بہار
سر جھکائے گا مرے قدموں پہ گلزارِ دکن!

تابشِ منظر

روز افزوں ہے شورِ بو لہبی
اک نظر اے محمدؐ عربی

آدمیت ہے نا تمام ہنوز
اور اب آئے گا نہ کوئی نبی

غمِ گیتی سے کیا نجات ملے
کم نہیں گو فشردہ عنبی!

آ رہے ہیں وہ آفتاب بدوش
زندہ باش اے فغانِ نیم شبی

پی رہا ہوں تری نگاہوں سے
دیکھ میرا مذاقِ تشنہ لبی!

ماتمِ امروز

باقی رہا نہ امن و سکوں کا نشاں یہاں
اب ہے محال سرخوشیِ جسم و جاں یہاں

صبحِ بہار کیا ہے؟ فقط اک فریبِ وقت
فرمانروا ہے روزِ ازل سے خزاں یہاں

پاتا ہوں مہر و ماہ کو غلطیدہ خاک پر
پنہاں ہر ایک ذرے میں ہے آسماں یہاں

ذوقِ نظر کے زیرِ نگیں ہے یہ کائنات
اک جنبشِ نظر میں ہے سارا جہاں یہاں

کرتا نہیں یقیں سے کوئی اکتسابِ نور
پھیلی ہوئی ہے ظلمتِ وہم و گماں یہاں

کلیاں بھی اشکبار رہیں شبنم بھی اشکبار
کیا غم کدہ ہے! کوئی نہیں شادماں یہاں

تو ہے خرابِ جام و سبو، تجھ کو کیا خبر
ساقی کی چشمِ مست بھی ہے مے فشاں یہاں

مجھ سے نہ پوچھ عالمِ امکاں کی وسعتیں
اک ذرّۂ حقیر بھی ہے بیکراں یہاں

اے بے خبر تپش سے عبارت ہے زندگی
تعمیر شاخِ برق پہ کر آشیاں یہاں!

مہاتما گاندھیؒ

مقامِ عظمتِ انساں کو تُو نے فاش کیا
جمود بستہ غلامی کو پاش پاش کیا

حیات صبحِ محبت کے نور میں گم ہے
عجیب چیز ترا دل کشا تبسم ہے

یہ جبر و قہر کے بندے، یہ شور و شر کے غلام
نہ پا سکیں گے تری زندگی کی رمزِ دوام

دِیا ہے صلح و مساوات کا سبق تُو نے
عطا کیا ہے جنوں کو "نیا اُفق" تُو نے

فنا کدے کو بنایا ہے جنتِ گلپوش"
رواں دواں ہیں جہاں نیل و گنگ دوش بدوش

یہ معجزہ ہے ترے ذوقِ تازہ کاری کا

کہ سرنگوں ہے فروغ فالِ شہریاری کا

نہیں ہے تیرے سوا کوئی رازدانِ وطن

تجھی سے فائزِ منزل ہے کاروانِ وطن

وفا کے راگ محبّت کی آگ لے کے گیا

تو اپنے ساتھ وطن کا سہاگ لے کے گیا

ستم سے رُوحِ صداقت کبھی نہ ہارے گی

نگاہِ عشق تجھے تا ابد پکارے گی!

منزلِ ممتاز

آسماں پر سرنگوں ہے چاند پچھلی رات کا
رنگ اُڑا جاتا ہے خود اُڑتے ہوئے لمحات کا

روشنی کھوئی گئی آئینۂ مہتاب سے
نرم رَو، خاموش جھرنے چونک اُٹھے خواب سے

زندگی کا گیت گایا چشمۂ کہسار نے
کھول دیں آنکھیں بالآخر نرگسِ بیمار نے

ٹہنیوں سے آبجو سرگوشیاں کرنے لگی
سرد و سنبل جاگ اُٹھے، کوئل فغاں کرنے لگی

شور سے مرغابیوں کے گونج اُٹھی مغموم جھیل
جگمگاتے راستے ہیں، مسکراتے سنگِ میل

چار سو فطرت نے انوارِ سحر پھیلا دیے

پھول پر تیتلی نے اپنے زرد پر پھیلا دیے

ہیں خس و خاشاک چمکیلے، شگوفے تابناک

غنچہ و گل شبنم آلودہ، فضائیں خوابناک

جھاڑیوں پر اک ملائم روشنی چھائی ہوئی

ریت کے ذرّے درخشاں، گھاس مرجھائی ہوئی

نوحہ گر ہے اک پپیہا ناشکیب و ناصبور

اُڑ رہے ہیں چند بگلے دھان کے کھیتوں سے دُور

دل میں بھر دی ہے نسیمِ صبحگاہی نے وہ آگ

جس کے پرتو میں جنوں کا زمزمہ وحشت کا راگ

کیا اثر ہے قمریوں کے صوُرِ صد آواز میں

گم ہوا جاتا ہوں مَیں اک منزلِ ممتاز میں!

نظارگی

ہر موڑ پہ تیرے راستے میں — ہیں فکر و نظر کی جلوہ گاہیں
اے راہ نوردِ شوق ہشیار — پُرپیچ ہیں زندگی کی راہیں

تاروں سے برس رہی ہے "مستی" — سورج سے چھلک رہے ہیں "اسرار"
وہ دیکھ اُفق میں جلوہ گر ہیں — منزل کے حیات خیز مینار!

ساون میں بھی ہے یہ خشک سالی — اک بُوند کو دل ترس رہا ہے
پانی کے بجائے آسماں سے — انساں کا لہو برس رہا ہے!

صرصر ہے جو روپ میں صبا کے — غنچوں کو جھلا رہی ہے جھولا
اکثر مَیں یہ سوچتا ہوں یارب — ہستی ہے کہ موت کا ہیولا!

پتے، کلیاں، شجر، حجر سب — ہوتے ہیں جب اُوس میں نہائے
گل کار فضا کی آڑ لے کر — بڑھتے ہیں خزاں کے زرد سائے!

کس شان سے آرہی ہے اختر — وہ مہر طراز ماہپارا
زلفوں میں اسیر روحِ ظلمات! — آنکھوں میں شراب جھلک آرہا!

تو "برف و گلاب" ہے مجسم — ہر نقش ہے دل نواز و دلجو
ایران کے سیب ہیں کہ رخسار! — شیراز کی رات ہے کہ گیسو!

مجاہد

مجاہد نام ہے اے دوست اُس انسانِ کامل کا
مٹا دیتا ہے جو اک وار میں ہر نقشِ باطل کا
سکھاتا ہے جو گردِ راہ کو اسرارِ الوندی
جو اپنے خون سے کرتا ہے لالے کی حنا بندی
ہے داخل جس کی فطرت میں جہانبانی، جہانگیری
ادا کرتا ہے اپنا سر کٹا کر رسمِ شبیری
نظر میں بجلیوں کی شعلہ افشانی، عبا سادہ
خدا کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے پر آمادہ
مجاہد فی الحقیقت شاہکارِ کبریائی ہے
زمیں سے عرشِ اعظم تک مجاہد کی خدائی ہے

مجاہد بے خطر ہوتا ہے مرگِ ناگہانی سے
مجاہد غسل کر سکتا ہے تلواروں کے پانی سے

حریمِ قدس کا راز آشنا معلوم ہوتا ہے
بسا اوقات یہ انسان خدا معلوم ہوتا ہے

مجاہد سازِ ہستی کے لئے مضراب ہوتا ہے
سمندر بھی مجاہد کے لئے پایاب ہوتا ہے

یہ جانِ فتح و نصرت ہے یہ رُوحِ کامرانی ہے
مجاہد مر نہیں سکتا مجاہد غیر فانی ہے

مُجاہد کو عطا ہوتا ہے منصب تشنہ کامی کا
اِسے کہتے ہیں غارت گر شبستانِ غلامی کا

نہ وہ تختِ خلافت ہے، نہ وہ تاجِ شہادت ہے
جہاں کو پھر کسی مردِ مجاہد کی ضرورت ہے!

روداد

ہے جہاں سودائیِ نورِ حیات
کون دیکھے آہ ناسورِ حیات

شورش و کاوش کی رہ میں بہہ گئی
زندگی برباد ہو کر رہ گئی

روز طنبورِ فغاں بجتا رہا
یاس کا سازِ گراں بجتا رہا

دل کی چنگاری کلی بنتی رہی
موجِ گیتی آندھیاں جنتی رہی

آگ برساتے رہے ہیں گرد باد
شعلہ خیز و شعلہ بیز و شعلہ زاد

عطرِ گل کا آشیاں جلتا رہا
ہر نفس فریاد میں ڈھلتا رہا

مشقِ جورِ ناروا ہوتی رہی
نو عروسِ ابر و گل سوتی رہی

صرصر و مریخ اذاں دیتے رہے
بربط و ساغر دھواں دیتے رہے

"حاصلِ رقص و غنا" بکتا رہا
خانقاہوں میں خدا بکتا رہا

سانس بادِ صبح کی گھٹتی رہی
عصمتِ برگ و ثمر لٹتی رہی

معجزے اُگلا کیے فاران و نیل — کانپتے رہرو، لرزتے سنگِ میل
چار سو لیتی رہیں انگڑائیاں — تر تبوں کی شب نما پہنائیاں
ہر قدم پر دوزخِ قلب و نظر — بے کسی کا جلوۂ وحشت اثر
لالہ زار و کوہسار و جوئے شیر — دوریٔ منزل سے نالاں راہ گیر
تھی نہاں در پردۂ فکرِ معاش — آدمیت کی تعفن خیز لاش
ہو گیا بے رنگ سیمائے سحر — بُجھ رہی ہے مشعلِ شمس و قمر

زرد رُو ہیں پھول، تارے سڑ گئے
شاید اس دُنیا میں کیڑے پڑ گئے!

طُوفان

جذب کر سکتا نہیں مجھ کو فنا زارِ حیات
رو نما ہے اب مرے آگے ضمیرِ کائنات

جس کے سینے پر گڑے ہوں یاس و حرماں کے علم
وہ ستاروں کی طرف کیونکر اُٹھائے گا قدم

چھپ گیا اے ہمنشیں انسانیت کا آفتاب
اب رُخِ احساس و عصمت ہے نقاب اندر نقاب

اسود و احمر کی دیوار دل میں ہے فطرت اسیر
کھو گیا شورِ فنا میں کیفِ طاؤس و نفیر

خاک بر سر ہے جمالِ سلسبیل و نیل و طور
رُوحِ آدم جھک رہی ہے پھر مشیت کے حضور

شورشِ دیر و حرم، ہنگامۂ کفر و یقیں
ہو گئے کتنے ہلال و مہر پیوندِ زمیں

تھرتھرائے جام و مینا، کانپ اُٹھے ساز و ایاغ
جھلملائیں کتنی شمعیں، بجھ گئے کتنے چراغ

سطوتِ آفاق لرزاں، ہم فشاں موجِ نسیم
ماہ و اختر پارہ پارہ، گلبن و صحرا دو نیم

کس قدر لاشیں پڑی سڑتی ہیں بے گور و کفن
"فتنۂ شب" سے ہے سنولائی ہوئی صبحِ وطن

چھا گئے ہیں نغمۂ ہستی پہ ویرانی کے راگ
اب وہ آنکھوں کے پیمانے نہ رخساروں کی آگ

عالمِ اسباب پر ہے تیرگی چھائی ہوئی
زندگی مجھ کو نظر آتی ہے گھبرائی ہوئی

پھر جہاں معمور ہوگا مستیٔ کردار سے
گونج اُٹھیں گے مے کدے تلوار کی جھنکار سے

شعلہ زن ہوں گے پیالے، ٹوٹ جائیں گے سبو
دیکھ مستقبل کے ماتھے سے ٹپکتا ہے لہو

کربلا انداز ہے پھر شورزارِ آب و گل
یہ طلسماتِ منظّم۔ یہ سرابِ مستقل

نکبت وبے مائگی کو دینے والی ہے خراج
صولتِ قارون و سنجر، عظمتِ اہرام و تاج

جاں بلب کلیوں کے دامن خون سے گلنار ہیں
پھر فضا میں اک نئے طوفان کے آثار ہیں

سینۂ گیتی پہ یہ طوفان جب لہرائے گا
عرش وامکاں کا تجمل خاک میں مل جائے گا

اپالو پر ایک شام

اے اپالو! مری شاداب امیدوں کے مزار

آج کیوں تیری فضاؤں میں چمکتے ہیں شرار؟

مسکراتے نہیں نورستہ کنول۔ کیوں آخر؟

(ہو گئی نزہتِ مسرور بھی محزوں آخر!)

میں نے پتھر کے دل۔ آہن کے جگر دیکھے ہیں

تیرے ساحل پہ بہت شمس و قمر دیکھے ہیں

لیکن انوار سے محروم ہیں یہ شمس و قمر

کھو گئی ہے غمِ گیتی کے دھندلکے میں نظر

کتنے طوفان ہیں بیتاب ترے سینے میں

کتنے جوہر ہیں درخشندہ اس آئینے میں

لے بمبئی کی مشہور بندرگاہ

کتنے منظر تری موجوں نے دکھائے ہیں مجھے
کتنے عصمت کے جنازے نظر آئے ہیں مجھے

جگمگاتے ہوئے شانوں کی نمائش کا جنوں
نرگسِ مست کے جادو، لبِ لعلیں کے فسوں

تیرے دامن میں ہیں افلاس کے مارے کتنے
تجھ پہ ٹوٹے ہیں ضیا بار ستارے کتنے

کتنی صبحوں پر اندھیرے ہیں یہاں چھائے ہوئے
کتنے سورج ہیں تری خاک میں گہنائے ہوئے

میرا احساس ہے مجروحِ شہنشاہ و وزیر
کتنے خوش پوش ہیں تاریک دل و مردہ ضمیر

ہے یہ افسردہ و مغموم تجلائے حیات
چھپ گیا ہے مری آنکھوں سے تماشائے حیات

ہوگئی شامِ حقیقت کی سحر گم تجھ میں
کتنے اشکوں نے اُٹھائے ہیں تلاطم تجھ میں

ذرّے ذرّے میں ہے اِس عالمِ ناپاک کے سانپ
رقص کرتے ہیں یہاں دولت و املاک کے سانپ

یہ سیاست کے دلی، دِین و تمدّن کے امام
کتنے کالے ترے راہوں میں ہیں مصروفِ خرام

آہ انسان کے قدموں پہ ہے انساں کی جبیں
کاش یہ پختہ عمارات ہوں پا بوسِ زمیں

کتنے ساقی ہیں یہاں بادہ نما زہر فروش
جاگ اُٹھے کاش تری سرد ہواؤں کا خروش

رُوح اس "دُوزخِ زرکار" میں گھبراتی ہے
دیکھئے ــــ کب ترے ماتھے پہ شکن آتی ہے!

صبحِ کاذب

یہ حشر گاہ، یہ تہذیب و کفر کے بازار
نظر نظر ہے خرابِ شکست و بست و فشار

یہ برق زارِ خرد، یہ نسیمِ صبحِ مراد
سرودِ شوق ہم آوازِ محشرِ فریاد

یہ زندگی کے جنازے یہ موت کے شہپر
یہ بزمِ آہ و فغاں، یہ سوادِ تاج و کمر

یہ مہر و ماہ کی لاشیں، یہ خون کے بادل
یہ حسرتوں کا اندھیرا، یہ چاندنی کے کنول

یہ جستجوئے سکوں، یہ فریبِ لوح و قلم
وہی بتوں کی جفائیں وہی خدا کے ستم

یہ صبح جس نے اُٹھائے ہیں خار و گل کے نقاب
ہوئی ہے کتنے ستاروں کے خون سے شاداب

یہ شعلہ فام نظارے، یہ گردشِ تقدیر
کیا گیا ہے مجھے کس زیاں کدے میں اسیر

نہ پوچھ ظلم خدائی و شہریاری کے
سبق دئے ہیں اُجالوں کو تیرہ کاری کے

دلوں کو لوٹ گئیں کم نگاہیاں کیا کیا
زمیں پہ ٹوٹ پڑی ہیں سیاہیاں کیا کیا

یہ کس نے چھیڑ دئے آندھیوں کے افسانے
شبِ بہار بھی لَو دے رہے ہیں گلخانے

یہ رُوحِ عصر، یہ ابنائے قیصر و سنجر
سیاہ داغ ہیں انسانیت کے ماتھے پر

دکھائے ہیں جو رسولوں نے سبز باغ نہ پوچھ

بجھے پڑے ہیں یہاں کس قدر چراغ نہ پوچھ

قدم قدم پہ یہاں برف کی چٹانیں ہیں

مگر لبوں پہ تلاطم کی داستانیں ہیں

غرور ٹوٹ نہ جائے جہاں پناہوں کا

کہ پستیوں میں تحمّل ہے اوج گاہوں کا

گداگروں میں ہیں انداز کج کلاہی کے

وہ کانپ اُٹھے در و دیوار قصرِ شاہی کے

"غبارِ موت" کی زد میں ہے کائنات ابھی

سحر کدوں پہ ہے طاری خزاں کی رات ابھی

رُخِ یقین و خودی پر نقاب ہے ابتک

حیات منتظرِ انقلاب ہے ابتک!

منزل

آج تک طے نہ ہوا مرحلۂ لوح و قلم
خون آلود ہیں کن شمس و قمر کے پرچم
مسکراتی ہے ابھی جلوہ گہِ لیل و نہار
اپنے پہلو میں لئے حضرتِ انساں کا مزار
ہائے یہ عارضِ گیتی پہ زر و سیم کے داغ
جل اُٹھے وقت کی محراب میں صرصر کے چراغ
کتنے دل مرکزِ ہستی سے جدا ہیں اب تک
وہی عرفان و وراثت کے خدا ہیں ابتک
کتنے طوفان لئے آہ یہ رات آئی ہے
کن ستاروں پہ اندھیرے کی گھٹا چھائی ہے

کس قدر ساز ہیں لب تشنۂ مضراب نہ پوچھ
کن سفینوں میں ہیں چلتے ہوئے گرداب نہ پوچھ
ناشنیدہ ہی رہے زندگیِ نو کے پیام
اُف یہ ہر گام پہ احساس و یقیں کا نیلام
یہ شرارے، یہ دلِ ارض و سما کی دھڑکن
مر کے اترا ہے تخیل کی غلامی کا کفن
ابنِ آدم سے مشیت ہوئی برہم کیا کیا
سینۂ خاک پہ بھڑکے ہیں جہنم کیا کیا
رنگ لاتی رہی افسردہ نوائی کیا کیا
دی ہے ظلمات نے سورج کی دہائی کیا کیا
ہیں رُخِ زیست پہ شعلوں کی خراشیں کیا کیا
جاگ اُٹھیں سنجر و فرعون کی لاشیں کیا کیا

کانپ اُٹھیں دین و رسالت کی چٹانیں کیا کیا

دل پہ لہرا گئیں قبروں کی زبانیں کیا کیا

محو ہے کب سے زمین موت کے نظارے میں

کتنے ناسور ہیں اس چیختے سیارے میں

زہر پی پی کے نکھرتا ہے خداؤں کا شباب

کتنی راتیں ہیں چراغوں کے لہو سے شاداب

بے کسی لوٹ گئی کتنی بہشتوں کے خیام

چاک در چاک ہیں کن برق وشوں کے احرام

یہ سلگتے ہوئے اشکوں کا تلاطم کب تک

لب ہستی پہ نہ آئے گا تبسم کب تک

مہر پاروں کو بجھائے گی سیاہی کب تک!

وادیٔ موت میں بھٹکیں گے یہ راہی کب تک!

رقص

یہ بزمِ جرم و وراثت، یہ شورِ رستا خیز
سوادِ خاک میں اب بھی ہیں کس قدر چنگیز

یہ دورِ جہل و روایت کے روسیاہ غلام
گمان و یاس کے رہبر، ہزیمتوں کے امام

غبارِ مرگ میں گم کاروانِ نغمہ و رنگ
دلِ بہار میں پیوست بےبسی کے خدنگ

نہ پوچھ کشتۂ ظلمت ہیں کس قدر خورشید
مہ و نجوم نے خود کی ہے رات کی تائید

جہاں فروز نہیں صبح کی جبیں اب تک
سیاہیوں کے شکنجے میں ہے زمیں اب تک

وہی نحیف فضائیں، وہی طلسمِ حیات

ہر ایک ذرّہ تاریک محورِ آفات

وہی خزاں ہے، وہی کاوشِ سموم و نسیم

یہ آندھیوں کے مصاحب، یہ زلزلوں کے ندیم

دیا گیا ہے سرِ کفر کن رسولوں کو

بہار کھا گئی کتنے کنول کے پھولوں کو

پنا دِل نہ سکی جبر گاہِ فطرت میں

کہاں ثبات حبابوں کی اس قیامت میں

دل و نظر کے لہو سے چراغ جل نہ سکے

سحر پرست اندھیرے کا رُخ بدل نہ سکے

غمِ سحر میں اندھیرے بھی خون رُوتے ہیں

کہ چاند صبح سے پہلے غروب ہوتے ہیں

لیا ہے عہدِ وفا کس کی "خوش نگاہی" نے

یہ کس نے توڑ دئے زندگی کے آئینے

چھپے ہوئے ہیں صنم کتنی آستینوں میں

"ظلامِ بحر" ہے روپوش کن سفینوں میں

یہ رنگ و نسل کے زنداں، یہ حسرتوں کے محل

نگارِ زیست کے چہرے پہ موت کا آنچل

ضمیرِ شبنم و ریحاں میں نقص باقی ہے

ہنوز سُرخ بگولوں کا رقص باقی ہے

فلک پہ خاک نشینوں کو جستجوئے سحر

زمیں پہ ٹوٹے ہوئے جبرئیل کے شہپر

یہی زمین کہیں آسمان نہ ہو جائے

جہانِ شمس و قمر کا دھواں نہ ہو جائے!

تعبیر

یہ حرم، یہ بتانِ شبنم و زنگ
یہ شرارے، یہ ظلمتوں کے خدنگ

اُف یہ قربان گاہِ ذکر و خبر
الاماں یہ مآلِ ذوقِ نظر

یہ تمدن کے خوں چکاں آلات
آگ کا گیت عصمتوں کی برات

ہائے یہ تیرگیِ فکر و ضمیر
کتنے جگنو ہیں روشنی میں اسیر

یہ بیاباں، یہ حسرتوں کا غبار
یہ شرار و سموم کے بازار

یہ سم افشانیاں بگولوں کی
نبض ساکت ہے کن رسولوں کی

دیکھ کر عطرِ گل کو شعلہ طراز
کن خداؤں کو دی گئی آواز

شورشِ بادِ انقلاب نہ پوچھ
بجھ گئے کتنے ماہتاب نہ پوچھ

اُٹھ گئے کتنے زلزلوں سے نقاب
لٹ گیا کتنی جنتوں کا شباب

ہو گیا نظمِ زندگی برہم
کھل گئے مرگ و یاس کے پرچم

قافلے رہ سپار ہو نہ سکے وشت آئینہ زار ہو نہ سکے

کیا خبر تھی کہ شمس و مہ کے حضور مسکرائیں گے رات کے ناسور

کتنے سینوں کے داغ جلتے ہیں آندھیوں میں چراغ جلتے ہیں

بزمِ ہستی کا انتشار وہی کفر و ایماں کے خارزار وہی

صبح کاذب وہ رنگ لائی ہے چاندنی بن کے دھوپ آئی ہے

یہ سحر، یہ ہزیمتوں کا کفن زندگی خود ہے زندگی دشمن

پھر وہی طوق، پھر وہی زنجیر!

اُف یہ خوابِ حیات کی تعبیر!

تاریخ

محبت سرنگوں، احساس ویراں
کہاں وہ زندگی کے شبستاں

کوئی مے کش، کوئی ساقی نہیں ہے
کسی جوہر میں برّاقی نہیں ہے

یہ صحرا، یہ تمدن کی دوکانیں
تڑپتی آندھیوں کی داستانیں

یہ ویرانے، یہ خونِ آدمیت
یہ غم خانے، یہ قبروں کی تجارت

یہ تہذیب وسیاست کے خریدار
ابھی ہیں گرم ناسوروں کے بازار

کہا کس نے بطرزِ محرمانہ
کہ آئے گا اک ایسا بھی زمانہ

بجھیں گے روشنی سے مہر واختر
بلا خانے ہنسیں گے جنّتوں پر

دلوں میں اس طرح گرہیں پڑیں گی
چٹانیں آبگینوں سے لڑیں گی

ثمر جھڑتے رہیں گے برگِ گل سے
دھواں اُٹھتا رہے گا ابروُل سے

کہیں گے پھول زخموں کے فسانے
کہ خود مرہم تراشیں گے بہانے

سفینے خود کناروں سے ڈریں گے
اُجالے صبح کا ماتم کریں گے

بھڑکو آگ کے دریا بہیں گے — شبستاں یونہی لَو دیتے رہیں گے
بہارستاں نہائیں گے لہو میں — خزاں لہرائے گی جام و سبو میں
اندھیرے خون میں گھلتے رہیں گے — شرارے نور سے دُھلتے رہیں گے
فنا کو زندگی آواز دے گی — سحر کو رات کے انداز دے گی
دلِ فطرت میں ویرانی بسے گی — سیاہی طور و فاراں کو ڈسے گی

سنیں گے آب و گِل خود چیخ اپنی
زمیں دہرائے گی تاریخ اپنی!

آج بھی......

میں نے مانا اب نظامِ گلستاں کچھ اور ہے
اب زمیں کچھ اور ہے، اب آسماں کچھ اور ہے
یہ جہانِ دشت و در، یہ عالمِ کوہ و کمر
اک نئی موجِ تجلّی سے درخشاں ہے مگر
ہمنشیں! انسانیت ہے خاک بر سر آج بھی
آج بھی اے ہمنشیں انساں ہے انساں کا شکار
یہ ہجومِ جرم و عصیاں، یہ امارت کا خمار
آج بھی زخموں پہ مرہم ہے نہ ہونے کی طرح
آج بھی تدبیرِ عالم ہے نہ ہونے کی طرح
آج بھی محنت کش و مزدور کی آنکھیں ہیں نم
دُرفشاں ہے منعموں پر آج بھی ابرِ کرم

آج بھی آواز آتی ہے کہ "منزل دور ہے"
آج بھی تقدیر اک رِستا ہوا ناسور ہے

غرق ہے اک سُرخ آندھی میں فضائے کاف و نوں
مفتیوں کو آج بھی ہے کفر سازی کا جنوں

آج بھی ہے نامکمل طلعتِ صبحِ وطن
ہے بہر سُو آج بھی اک منظرِ گور و کفن

آج بھی ہیں رنگ محلوں میں ہزاروں آفتاب
جھونپڑے ہیں آج بھی مغموم اور ظلمت مآب

آج بھی تحصیل حاصل ہے سکوں کی جستجو
خنجروں سے آج بھی اکثر ٹپکتا ہے لہو

آج بھی افلاس و نکبت عام ہے اس دیس میں
پائے جاتے ہیں درندے اہلِ زر کے بھیس میں

آج بھی افسردہ ساماں ہے شبابِ کائنات
آج بھی مضراب سے محروم ہے سازِ حیات

بجلیوں میں آج بھی محصور ہے میرا چمن
آج بھی بے آبرو ہے وادیٔ گنگ و جمن
آج بھی ہے آتشِ احساس کجلائی ہوئی
سرزمینِ عطر و گل پر ہے خزاں چھائی ہوئی
ہو رہی ہے زندگی سے موت کی نشو و نمود
آج بھی لاانتہا کلیاں ہیں محتاجِ کشود
ہے سوادِ زندگی تاریک بھی۔ تاراج بھی

شاعر کا ترانہ

محرمِ شبنم رفیقِ لالۂ صحرا ہوں مَیں
ہمنشینِ یاسمین و نرگسِ شہلا ہوں مَیں
چاند اور سورج کا ہمدم ہوں فلک پیما ہوں میں
آج تک محوِ تلاشِ فطرتِ کبریٰ ہوں میں

بربطِ قدرت کے نغمے، عشرتِ سوزاں کی آگ
کیا بجھا سکتے ہیں میرے سینۂ سوزاں کی آگ؟

خاک سے پیدا ہوئے گلہائے تر میرے لئے
اوس کی بوندیں بنیں لعل و گہر میرے لئے
ہے جہاں میں حسنِ فطرت جلوہ گر میرے لئے
رنگ و نکہت، کیف و کم، تاج و کمر میرے لئے

ہے ازل سے میرے پہلو میں دلِ مومن نہاد
میری نظریں توڑ دیتی ہیں طلسمِ برق و باد

زلزلے ہوں یا کواکب، سب مرے زیرِ نگیں
کھول سکتا ہوں مَیں قفلِ آسمان و بابِ زمیں
میرا دل رطلِ گراں میری نگاہیں دوربیں
میرے قدموں پر جھکائی ماہپاروں نے جبیں
عشق و مستی کا ربابِ زرفشاں رکھتا ہوں میں
آستینوں میں یدِ بیضا نہاں رکھتا ہوں میں

بھر دیا مَیں نے ایاغِ لالہ میں خونِ بہار
جابر و سرکش عناصر پر ہے میرا اختیار
ہیں مرے اشعار دستِ غیب کے نقش و نگار
حوریانِ خلد کو اب تک ہے میرا انتظار
ظلمتِ افسردہ کو میں نے عطا کی ہے چمک
بجلیوں کے دوش پر کرتا ہوں میں سیرِ فلک

اِس طرح کہسار سے آتی ہے جوئے نرم رَو
ابر کے روزن سے گویا جھانکتا ہے ماہِ نو

جاں بلب بجمِ سحر میں ہے ابھی ہلکی سی ضَو
عرش کو چھونے لگی میرے چراغِ دل کی لَو

شاہدِ ہستی تصدق ہے مرے انداز پر
رُخ بدلتا ہے زمانہ میری ہر آواز پر

جب چمن میں رات کو ہوتی ہیں کلیاں محوِ خواب
رقص کرتے ہیں ستارے، گنگناتا ہے شباب

جب اُلٹ دیتا ہے سورج اپنے چہرے سے نقاب
مجھ سے ملنے کے لئے آتی ہے صبحِ انقلاب

گلستاں کو اک بہشتِ مختصر پاتا ہوں میں
ذرّے ذرّے میں دلِ شمس و قمر پاتا ہوں میں

ہے شرابِ عشق سے روشن مرا جامِ سفال
جس کے ہر قطرے میں ہے جبریل کا نورِ جمال

غیرتِ بزمِ دو عالم ہے مری بزمِ خیال
پھول کی کیف آفرینی، بادِ صرصر کا جلال

میرے ہاتھوں میں زمامِ اشہبِ ایام ہے
ہم نفس! میری نوائے زندگی الہام ہے

بادۂ تخلیق سے لبریز ہے میرا کدو
میرے نالوں سے خس و خاشاک میں ذوقِ نمو

گونجتی ہیں جب مری نازک نوائیں چار سو
دوڑ جاتا ہے رگِ آہن میں ریشم کا لہو

ہیں مری نظمیں جمالِ حسن کی آئینہ دار
مَیں رسولِ عشق ہوں۔ پیغمبرِ برق و شرار

کس قدر محکم ہے میری قوتِ نقد و نظر
تیرگی میرے لئے رکھتی ہے آثارِ سحر

مضطرب ہے میری آہوں کیلئے بابِ اثر
بارشِ اسرار ہوتی ہے مرے انفاس پر

فطرتِ ہستی مری ہستی میں آرامیدہ ہے
میرے ایک اک حرف میں دنیائے کُن پوشیدہ ہے

شاعرِ فطرت ہوں مَیں، آتش نفس، آتش بجاں
میری نفرت بیکراں، میری محبت بیکراں
چار سو لے کیفیاں پھیلا رہی تھی جب خزاں
صرف میں تھا سو گوارِ انقلابِ گلستاں

کاروانِ خفتہ کو میں نے صلائے ہوش دی
حسن کے شانے ہلا کر دعوتِ آغوش دی

ہے مرے ہر لفظ، ہر نقطے میں پیغامِ حیات
مَے گسارِ زندگی ہوں، بادہ آشامِ حیات
غنچۂ نوخیز نے باندھا ہے احرامِ حیات
یونہی گردش میں رہے گا تا ابد جامِ حیات

دہر میرے کارناموں کو بھلا سکتا نہیں
سرمدی ہوں مَیں، مجھے کوئی مٹا سکتا نہیں!

ہمنشینِ اقبالؒ کا پیغام

(نفیرِ وقت)

اذاں کا وقت ہے یہ، شعر و داستاں سے گزر
زمیں کو دیکھ، تماشائے آسماں سے گزر

تلاشِ امن ہے بیکار اس زمانے میں
ہے برگِ گل بھی شرر بار اس زمانے میں
ہر ایک شاخ ہے تلوار اس زمانے میں
عمل ہے زیست کا معیار اس زمانے میں

اذاں کا وقت ہے یہ، شعر و داستاں سے گزر
زمیں کو دیکھ، تماشائے آسماں سے گزر

مئے یقیں سے ہے خالی ترا ایاغِ شعور
وگرنہ اُوس کی ہر بوند ہے شرابِ طہور
کلی کلی سے نمایاں ہے داغِ لالۂ طور
نگاہِ شوق ہے درکار اس زمانے میں

اذاں کا وقت ہے یہ، شعر و داستاں سے گزر
زمیں کو دیکھ، تماشائے آسماں سے گزر
نہ وہ تجمّلِ جمشید ہے نہ حشمتِ کَے
اثر سے اپنے ہے محروم آج نالۂ نَے
ہوس نے عشق نے بیگانہ تجھ کو رکھا ہے
کہاں وہ دولتِ بیدار اس زمانے میں

اذاں کا وقت ہے یہ، شعر و داستاں سے گزر
زمیں کو دیکھ، تماشا سے آسماں سے گزر

وہ سادہ مردِ مجاہد، شہیدِ نازِ خودی
یقین و عزم سے چھیڑا ہے جس نے سازِ خودی
ہوا ہے جس کی نگاہوں پہ فاش رازِ خودی
وہی ہے محرمِ اسرار اِس زمانے میں

اذاں کا وقت ہے یہ، شعر و داستاں سے گزر
زمیں کو دیکھ، تماشائے آسماں سے گزر
غلام اُس کے، یہ پربت، یہ نیلگوں افلاک
وہ برقِ شعلہ فشاں اور جہاں خسُ خاشاک
ہے اس کا صیدِ زبوں شیرِ فطرتِ چالاک
جو مشتِ خاک ہے خود دار اس زمانے میں

اذاں کا وقت ہے یہ، شعرِ و داستاں سے گزر
زمیں کو دیکھ، تماشائے آسماں سے گزر

عمل کے سوز سے ضو کار ہے چراغِ حیات
عمل کی شمعِ فروزاں دلیلِ راہِ نجات
نہاں ہے ذوقِ عمل میں فلاحِ موجودات
نہ ڈھونڈ لذتِ گفتار اس زماتے میں

اذاں کا وقت ہے یہ، شعر و داستاں سے گزر
زمیں کو دیکھ، تماشائے آسماں سے گزر
ابھی کمالِ خرد ہے خرد کی بے ہنری
ابھی جنوں ہے اسیرِ قیودِ جامہ دری
ابھی حیات ہے نا آشنائے "جاں سپری"
اہم ہے مستیٔ کردار اِس زمانے میں

اذاں کا وقت ہے یہ، شعر و داستاں سے گزر
زمیں کو دیکھ، تماشائے آسماں سے گزر

دل و دماغ پریشاں، سکونِ جاں نایاب
سفینہ سوز ہیں بحرِ وجود کے گرداب
اُلٹ دیے ہیں خودی نے حقیقتوں کے نقاب
کہ عام ہیں رسن و دار اس زمانے میں

اذاں کا وقت ہے یہ شعر و داستاں سے گزر
زمیں کو دیکھ، تماشائے آسماں سے گزر
ہر ایک لحظہ فزوں ہے جلالِ تاج و کمر
سکندری کے دُھندلکے میں کھو گئی ہے نظر
اُٹھا وہ پرچمِ خونیں! ہٹا یہ ساغرِ زر!
مجھے عزیز ہے تلوار اِس زمانے میں
اذاں کا وقت ہے یہ، شعر و داستاں سے گزر
زمیں کو دیکھ، تماشائے آسماں سے گزر

لاوا

غبار آلود و بے نزہت ہے صبحِ انقلاب ابتک
نئے سورج اُفق کی گود میں ہیں محوِ خواب ابتک

جہاں پر صرصر و مرّیخ کی فرماں روائی ہے
مشیّت کو یقیناً زلزلوں کی یاد آئی ہے

رہیں گے مے کشوں کے منتظر ویران مے خانے
ابھی ہیں نامکمل آتش و آہن کے افسانے

ابھی کلیوں کی لاشوں پر خزاں کو رقص کرنا ہے
ابھی کچھ اور عالمگیر ظلمت کو نکھرنا ہے

زمیں پر ٹوٹ کر گرنا ہے لاکھوں آسمانوں کو
بھٹکنا ہے خزاں کی وادیوں میں کاروانوں کو

ہزاروں قافلوں کو رہزنوں کی نذر ہونا ہے
عروسِ زندگی کو اپنی تنہائی پہ رونا ہے

رہیں گی آدمی کے پاؤں میں سونے کی زنجیریں
دکھاتا ہے زمانہ مجھ کو آتش رنگ تصویریں
کہیں روٹی کے لالے ہیں کہیں زرّین و شالے ہیں
ابھی سرمایۂ و محنت کے فتنے بڑھنے والے ہیں
تن آساں صوفیوں کو خانقاہوں سے نکلنا ہے
فرشتوں کو ابھی انسان کے سانچے میں ڈھلنا ہے
صنم زاروں میں آنا ہے ابھی کتنے رسولوں کو
نگارِ عطر و گل کا خون پینا ہے بگولوں کو
فلک پر خودکشی کر لی ہے کتنے مہ پاروں نے
کئے شیطاں کو سجدے کس قدر یزداں شکاروں نے
خدا جانے کب آ جائے تباہی نوعِ انساں کی
کہ اب گرداب میں ہیں کشتیاں احساسِ عرفاں کی

شکستہ ہو گئے ہیں عصمت و ایماں کے آئینے

جلایا ہے چمن کو خود نسیمِ صبح گاہی نے

بغاوت کے تحیر آفریں شعلے بھڑکتے ہیں

کہ مزدوروں کے آنسو تاجِ گوہر میں چھلکتے ہیں

جو بھر دیتا ہے وحشت ناک طوفان آبگینے میں

وہ لاوا کھولتا ہے مادرِ گیتی کے سینے میں

غریبوں کے لہو سے قصرِ شاہی جگمگائے گا

حریمِ ابر و گُل بربادیوں کے گیت گائے گا

دُھندلکے روشنی کے آستاں پر سر جھکائیں گے

فضا میں سُرخ سیلابوں کے پرچم لہلہائیں گے!

چارۂ کار

گردبادوں کو ہر اک دشت پہ چھا جانے دو

اور ابھی اژدرِ تقدیر کو بل کھانے دو

رنگ و بو کے لئے پھولوں تڑپنے دو ابھی

آسمانوں سے یونہی زہر برسنے دو ابھی

ہے سحر دور ابھی درمانِ گراں خوابی کو

اور بڑھنا ہے ستاروں کی تنک تابی کو

اور ہونا ہے فزوں شورشِ پیہم کو ابھی

لہلہانے دو یونہی رات کے پرچم کو ابھی

لالہ زاروں کو گرفتارِ خزاں رہنے دو

ماہ پاروں کو اندھیرے میں تپاں رہنے دو

شیون و آہ میں نغمات کو ڈھلنے دو ابھی
یاس کی آگ میں انسان کو جلنے دو ابھی

ہاں ابھی فیصلہ کفر و یقیں ہونا ہے
حرم و دیر کو پابوسِ زمیں ہونا ہے

ہاں مشیت کو یونہی مشقِ ستم کرنے دو
ثبت ہر چیز پہ عنوانِ عدم کرنے دو

یہ سیاست کی سیاہی یہ حقیقت کے فریب
یونہی جمہور پہ چلنے دو امارت کے فریب

ہے زمانے کو ضرورت ابھی انگاروں کی
آج بھی پیاس بدستور ہے تلواروں کی

موت کے سائے میں ظلمت کو ابھی جینے دو
بادِ صرصر کو شگوفوں کا لہو پینے دو

فکر و احساس کی شمعوں کو بجھانا ہے ابھی
خون میں عظمتِ آدم کو نہانا ہے ابھی
امن ادراک کے ماتھے پہ شکن رہنے دو
یونہی لاشوں کو طلبگارِ کفن رہنے دو
وعدۂ کوثر و تسنیم سے پرچائیں گے
کس کو معلوم ابھی کتنے رسول آئیں گے
عشق مصروف ہے جلووں کی فسوں کاری میں
ہے ابھی "مہرومہِ نو" کی ضیا باری میں
طلعتِ عشق ہی جب تک نہ ہو فردوسِ خیال
ماند پڑتا ہے کہیں آتش و آہن کا جلال!
عشق جب درپۓ تعمیرِ جہاں ہوتا ہے
حور کا رقص فرشتے کی اذاں ہوتا ہے!

صبح سے پہلے

یہ رات دن، یہ گریبانِ شمس و ماہ کے چاک
یہ شعلہ زار، یہ آدم، یہ فطرتِ چالاک
یہ شامِ غم، یہ مشیت کی جبر سامانی
یہ بزمِ فکر و نظر، یہ دلوں کی ویرانی
یہ کاوشِ غمِ گیتی یہ گردشِ مہ و سال
کہاں وہ لذتِ ایماں کہاں وہ حسنِ خیال
یہ برق ریز حوادث، یہ فتنہ کار نجوم
یہ روشنی کے نشیمن میں ظلمتوں کا ہجوم،
یہ بے کسی کے جنازے، یہ حسرتوں کا کفن
یہ بے کنار اُفق آفتاب کا مدفن

یہ آنسوؤں کا تلاطم، یہ زندگی کے مزار
یہ بےبسی کی ہوائیں، یہ قہقہوں کا غبار
یہ خانقاہوں کے پھندے، کلاہ و قصر کے دام
سرابِ دولت و سطوت، فریبِ علم کلام
یہ تاج و تخت کے ہیرے، یہ موت کے ناسور
جھکا ہوا ہے سرِ زندگی اجل کے حضور
یہ جبر و جہل کے طوفاں، یہ بارشِ آلام
تڑپ رہے ہیں اندھیرے میں کتنے ماہ و تمام
خزاں کی زد میں شگوفے جو مسکرائے ہیں
سمن کدوں نے تباہی کے گیت گائے ہیں
نہ پوچھ رہزنِ عرفان و ہوش ہیں کتنے
بنامِ خودنگری خودفروش ہیں کتنے

بھٹک رہے ہیں امیدوں کے قافلے کیا کیا
جہانِ شوق میں آئے ہیں زلزلے کیا کیا
یقین و کفر متاعِ حیات لوٹ چکے
ربابِ حُسن و صداقت کے تار ٹوٹ چکے

نہ وہ سرورِ حقیقت، نہ وہ طلسمِ جمال
ہوئی ہیں کتنے شہیدوں کی تربتیں پامال
اُمڈ رہی ہے سیاہی کہ بجھ رہے ہیں کنول
سلگ رہا ہے عروسِ حیات کا آنچل
وہ تھرتھرائے محل، وہ ضمیر کانپ اُٹھے
وہ جھومتے ہوئے لعل و گہر کے سانپ اُٹھے
چھلک رہے ہیں ابھی تو سیاہیوں کے ایاغ
یہ کس نے صبح سے پہلے بجھا دئے ہیں چراغ!

آدمِ نو

خزاں اب تک محیطِ گلستاں ہے
سوادِ عطر و گل ماتم کناں ہے

ضمیروں میں یہ قرنوں کی سیاہی
دگرگوں ہے جہانِ مُرغ و ماہی

بہر سو جہل و عصیاں کے تلاطم
نہ ہو جائے دُھندلکوں میں سحر گم

بھڑک اُٹھے ہیں پھولوں کے نشیمن
(یہ پھولوں کے نشیمن ہیں کہ مدفن!)

فنا کی نیند سو جائے نہ دنیا
لہو میں غرق ہو جائے نہ دنیا

یہ سیلابوں میں چکراتے سفینے
چٹانوں کے مقابل آبگینے

وہی ظلمت کے صبحوں کے ورق پر
جلیں گی کب نئی شمعیں افق پر!

ستارے مضمحل، رہبر نہ رہی
کہاں ہے اے جمالِ صبحگاہی!

شبِ غم، یہ شبِ غم کا اندھیرا
شبستانوں میں نفرت کا بسیرا

جہاں سورج اندھیرے میں نہائیں
وہاں کیوں کر اُمنگیں مسکرائیں

فلک سے جب زمیں پر زہر برسے
تو شبنم کیوں شراروں کو نہ ترسے

دلوں پر یاس کا پرچم جو لہرائے
فسانوں میں حقیقت کیوں نہ کھو جائے

کہاں وہ زندگی کے مرمریں خواب
تمنا مضطرب، تخئیل بیتاب

حوادث کی جبینیں پُر شکن ہیں
اُمیدیں خود اُمیدوں کا کفن ہیں

ستم افشاں ہیں سیہ بادل
حدیثِ زندگانی نامکمل!

وہ اُبھریں چاند سورج پر خراشیں
وہ جاگیں قیصر و سنجر کی لاشیں

وہ آگ اور خون کا طوفان آیا
وہ دیکھو وہ نیا انسان آیا!

رات

جلا رہی ہے مری آتشِ دروں مجھ کو
ہر ایک پھول سے آتی ہے بوئے خوں مجھ کو
ابھی ہے تشنۂ تعبیر خوابِ آزادی
یہ کربلائے وطن، یہ سرابِ آزادی
یہاں بہار خزاں کا پیام لائی ہے
امید یاس کے سانچے میں ڈھل کے آئی ہے
یقین و کفر کے ناسور ہیں دماغوں میں
بجائے نور اندھیرا ہے ان چراغوں میں
دلِ حزیں ستم و جورِ انقلاب نہ پوچھ
سحر نے چھین لئے کتنے آفتاب نہ پوچھ

وہی نقاب ہے روئے جمیلِ ہستی پر

چھڑک رہے ہیں لہو اہلِ عرش پستی پر

وہی زمین ہے، وہی رنگِ آسماں ابتک

کہ ظلمتیں ہیں اُجالوں کی پاسباں ابتک

جھلک رہا ہے غمِ دل ابھی نگاہوں سے

ابھی حیات کو فرصت نہیں ہے آہوں سے

ابھی عوام ہیں مرعوبِ ظلِّ سبحانی

ابھی دلوں میں ہیں پنہاں دلوں کی طغیانی

بجھی بجھی ہے بغاوت کی آگ سینوں میں

اُبل رہا ہے ابھی زہر آبگینوں میں

مقامِ عشق سے انسان بے خبر ہے ابھی

نگارِ عصمت و ایماں برہنہ سر ہے ابھی

ابھی لباسِ عروسی سے بن رہے ہیں کفن
کہ زندگی سے گریزاں ہے زندگی کی کرن

رہی نہ طلعتِ احساس و آگہی اے دوست
کہ سَم فشاں ہیں جراثیمِ گمرہی اے دوست

قدم قدم پہ بدلتا ہے رُخ زمانے کا
قفس نے بھیس بنایا ہے آشیانے کا

ڈبو دیا ہے تمدّن کی ناخدائی نے
غبار خیز ہیں مہر و وفا کے آئینے

چمک رہی ہیں ابھی محفلیں امیروں کی
مٹی نہیں ہے سیاہی ابھی ضمیروں کی

ہنوز تیرگیٔ کائنات باقی ہے
یہ صبح، صبحِ پریشاں ہے۔ رات باقی ہے

کفن

یہ حیرت خانۂ ادراک محور ہے سرابوں کا

لہو چوسا ہے تاریکی نے کتنے آفتابوں کا

جہاں پہ بجھتے رہے مغموم کجلائے ہوئے تارے

سیاہی میں وہاں گم ہو گئے کتنے قمر پارے

امنگوں کو جہاں احساس نے گلرنگ پایا ہے

وہاں ذہنوں پہ آسیبِ خرد کا زرد سایہ ہے

خزاں نے پرورش کی ہے جہاں خونی ہواؤں کی

وہاں خود باغباں کے دوش پر نعشیں ہیں پھولوں کی

جہاں آزادیوں نے زندگی کے راگ برسائے

وہاں قلب و نظر پر بے بسی کے ناگ لہرائے

جہاں ملتی ہے تابِ سنگ و آہن آبگینوں کو
ڈبویا ہے وہاں خود ناخداؤں نے سفینوں کو
جہاں شاخِ نشیمن بجلیوں پر مسکراتی ہے
کنارے سے وہاں طوفان کی آواز آتی ہے
سحر کے گیت گائے ہیں جہاں مایوس اسیروں نے
اندھیرے کی پرستش کی وہاں روشن ضمیروں نے
جہاں چہرے خلوص و آدمیت کے گلستاں ہیں
دماغوں پر وہاں نفرت کی شمعیں ظلمت افشاں ہیں
جہاں دل ناشناسِ مستی بیدار ہوتے ہیں
وہاں حدِ نظر تک زنگ کے انبار ہوتے ہیں
جہاں رقصاں ہیں چاندی کے سبو سونے کے پیمانے
جھلکتے ہیں وہاں افلاس کے غم ناک ویرانے

جہاں برپا ہوئی ہے انجمن یارِ سمن بر کی
وہاں پرکھی گئی ہے کونپلوں پر دھار خنجر کی

جہاں فردوس کا پیغام ہے بادِ بہاری میں
وہاں کھوئے گئے کتنے ترانے آہ وزاری میں

جہاں سب کی نگاہیں ماورائے عرش وکرسی ہیں
وہاں کتنے حقائق نوحہ خوانِ کس مپرسی ہیں

جہاں کثرت میں یکتائی کا پرچم لہلہاتا ہے
وہاں انساں فریبِ منبر ومحراب کھاتا ہے

جہاں تاریک ذرے ماہ وپروین میں بدلتے ہیں
وہاں ہر سانس میں زہراب کے چشمے اُبلتے ہیں

جہاں دیتے ہیں سورج ایک ننھی سی کرن لے کر
وہاں خود زندگی آئی ہے کافور وکفن لے کر!!

امید

چاند سلطانہ کے قلعے پر فرنگی پرچم کو لہراتا ہوا دیکھ کر

زندگی محشرِ خاموش ہوئی جاتی ہے
دہر زندانِ مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں
ہو رہا ہے مجھے محسوس کچھ ایسا اے دوست
زیست اک تلخ حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں

اُف یہ غمناک سکوت، آہ یہ بے برگ درخت
منکشف ہیں دلِ مجبور پہ اسرارِ حیات
کاش اس جنتِ ویراں میں مجھے مل سکتی
چند لمحوں کے لئے کاہشِ دوراں سے نجات

دامِ ظلمت میں ہیں رخشندہ فلزات ابھی
قلعہ بر میں ہے چاند نظر بند ابھی

نورِ تقدیس میں ہے وحشتِ عصیاں کی جھلک
خانقاہوں میں ہیں ابلیس کے فرزند ابھی

اب نہ وہ چشمۂ مہتاب نہ وہ جوشِ نمو
ایک مدت سے گلستاں پہ مسلط ہے خزاں
بزم خاموش ہے فرسودہ ستاروں کی طرح
اب نہ وہ مطربِ نوخیز نہ وہ سازِ گراں

ہے اُسی جدّتِ کردار کی مظہر یہ فصیل
ذرّے ذرّے میں وہی سوزِ جواں ہے ابتک
یہ حقیقت ہے کہ باقی نہ رہا عزمِ خلیل
نارِ نمرود مگر شعلہ فشاں ہے ابتک
لے کر اک مشعلِ خورشید فسکار آئے گی
مجھ کو امید ہے پھر صبحِ بہار آئے گی!

آخرِ شب

نئی سحر میں دھندلکے بدلنے والے ہیں

چمن کی خاک پہ مصروفِ رقصِ پیہم ہے

تمام جوشِ بہاراں، تمام سیـ

اُبل رہے ہیں سرورِ خودی کے فوارّے

چھلک رہے ہیں نشاطِ خود آگہی کے

چمک رہا ہے فضا میں خلوص کا پرچم

بسی ہوئی ہے فضا میں حیات کی

فلک پہ آخرِ شب کی لکیر دوڑ چلی

زمیں نے کھول دئے اپنے ریشمیں گ

خود اپنے کیف میں سرشار بادۂ احمر

خود اپنی آگ میں بیتاب لالۂ

سکوتِ شوق میں ڈوبے ہوئے زمان و مکاں

طلسمِ حُسن سے معمور عالمِ من و تو

وہ شاخِ تاک جھکی۔ روحِ نیستاں جاگی

وہ مسکرائے ترانے، وہ جگمگائے کدو

یہ آب و تاب نہ تھی نیم وا شگوفوں میں

مجھے یقین ہے کہ موجِ ہوا میں ہے جادو

وہ راگ چھیڑ گئی ہے نسیمِ نرم خرام

کہ شعلہ زن ہے رگِ خار و خس میں ذوقِ نمو

نہ اب وہ گردشِ افلاک ہے نہ دردِ حیات

نہ اب وہ رشتۂ زنّار ہے نہ ظرفِ وضو

تمام طوق و سلاسل پگھلنے والے ہیں!

مآل

آئی تھی رُوحِ فطرت صبحِ بہار بن کر
آئی تھی روحِ فطرت صبحِ بہار بن کر
صبحِ بہار بن کر۔ آئینہ دار بن کر

غنچے مہک رہے تھے، کلیاں چٹک رہی تھیں
اک شرمگیں ادا سے شاخیں لچک رہی تھیں

سبزے پہ مے کدے سے برسائے تھے صبا نے
حدِّ نگاہ تک تھے الماس کے خزانے

ہر پھول شعلہ رو تھا، مینائے رنگ و بو تھا
گلشن میں ذرّہ ذرّہ شورش گہِ نمو تھا

وہ کیف زا شگوفے، وہ خواب ناک سائے
وہ سیلِ رنگ جس پر جنت کو رشک آئے

ساغر میں تابِ ناکی، رخشندگی سبو میں
کھوئی ہوئی تھی دنیا انوارِ آرزو میں

تاریک دشت و صحرا غوبار ہو رہے تھے
پودے سب از سرِ نو بیدار ہو رہے تھے

ہر چیز پر جوانی۔ ہر چیز جاودانی
تھی خاک بھی گلابی، پانی بھی ارغوانی

موجِ ہوا چمن میں یوں سرسرا رہی تھی
گویا حیاتِ نو کا پیغام لا رہی تھی

تاباں تھی گلبنوں میں، رقصاں تھی وادیوں پر
اک طلعتِ مکمل۔ اک عشرتِ سراسر

انگڑائی لی جو ہنس کر بہنائے گلستاں نے
ناگاہ اپنے گیسو پھیلا دئیے خزاں نے!

سموم و نسیم

ہے یہ پیغمبرِ فطرت اِسے کہتے ہیں نسیم
اس کی چھاگل سے ٹپکتی ہے نبیذِ تسنیم
اِس کے نغموں سے ہیں مرغانِ سحر وجد کناں
ٹہنیاں وجد کناں، برگ و ثمر وجد کناں
رقص کرتی ہے فضاؤں میں ترنّم بن کر
دوڑ جاتی ہے لبِ گُل پہ تبسّم بن کر
یہ جہاں چشمۂ کوثر میں نہا کر آئی
چار سو گونج اُٹھا زمزمۂ برنائی
یاسمین و سمن و سنبل و ریحاں اِس کے
ہر طرف عطر فشاں گیسوئے پیچاں اِس کے

جب اِسے رُوحِ چمن حکمِ اذاں دیتی ہے
یہ خس و خار کو چشمِ نگراں دیتی ہے

شاخسار اِس کی نواؤں سے ہیں معمورِ سرود
لالہ خونیں کفن و سبزہ و گل مستِ نمود

اِس کی ہر موج میں پیغامِ خود افروزی ہے
جو رگِ گیت کی شیرینیٔ و دل سوزی ہے

مرغزار اس کی تگ و دو سے جواں ہے کہ نہیں
دیکھ ہر پھول بہاروں کا جہاں ہے کہ نہیں!

یہ سہیلی ہے اجل کی اِسے کہتے ہیں سموم
اس کے دامن میں تڑپتے ہوئے شعلوں کا ہجوم

ہر نفس خندہ زنِ آتش و آہن اس کا
آسماں گیر بگولوں میں نشیمن اس کا

اہلِ مریخ سے لیتی ہے تباہی کا سبق
موڑ دیتی ہے فلک بوس پہاڑوں کے ورق

ہے یہ تاراج گرِ انجمنِ سرو و سمن
چاٹ جاتی ہے شگوفوں کو یہ اندھی ناگن
پھن اُٹھائے ہوئے پھرتی ہے بیابانوں میں
زہر ہے اس کے دہکتے ہوئے پیمانوں میں
اس کی ہر موج سسکتی ہوئی کلیوں کا مزار
مضطر و حشر بداماں و جہنّم بکنار
اس کی ہر سانس نقیبِ آگ کے طوفانوں کی
ملکہ ہے یہ بھڑکتے ہوئے ویرانوں کی
اِس پہ سائے ہیں لچکتی ہوئی تلواروں کے
لطف آتا ہے اِسے کھیل میں انگاروں کے
گنگناتی ہوئی جب دشت پہ چھا جاتی ہے
ذرّے ذرّے سے دُہائی کی صدا آتی ہے!

سیف و سبو

خاکستر:-

سرد ہو جاتی ہے جب گل رنگ پیمانوں کی آگ
نا امیدی لوٹ لیتی ہے تمنا کا سہاگ

روحِ مے باقی نہیں رہتی مے سرجوش میں
پرورش پاتی ہے ظلمت نور کی آغوش میں

گونج اٹھتے ہیں فضا میں رنگ و بو کے مرثیے
جھلملاتے ہیں بہار افروز غنچوں کے دیے

رقص کرتی ہیں خزاں کی مضمحل پرچھائیاں
بار ہوتی ہیں نظر پر حسن کی رعنائیاں

قالب صحرا میں ڈھلتے ہیں جنوں افزا چمن
ہر ترنّم شعلہ آگیں، ہر تبسّم دل شکن

آج ہے میرے خیابانِ وطن کا بھی یہ حال
اب نہ وہ نسریں کی ہی زیبائی نہ لالے کا جمال
ایک مدت سے ربابِ دلبری ہے پاش پاش
ہے ابھی تک نازنیں چہروں پہ فاقوں کی خراش
سرد ہو کر رہ گئی گلرنگ پیمانوں کی آگ
لُٹ گیا اے ہمنشیں میری تمنّا کا سہاگ
رہ گئی اک شورشِ پیہم کی ماری زندگی
آتشِ احساس کی شدت سے عاری زندگی

تعمیرِ نَو

مسکراتا ہے فضا میں جب لوائے انقلاب
گوشے گوشے میں دل آرائی کے بجتے ہیں رباب
ساز کے پردے اُلٹ دیتی ہے تیغِ ناصبور
آبگینے توڑ دیتے ہیں چٹانوں کا غرور

دور کرنے کے لئے مفلوج شمشیروں کا زنگ

خون میں تبدیل ہو جاتی ہے موجِ آبِ رنگ

پچمچا اُٹھتے ہیں خنجر، گنگناتے ہیں بگل

سخت لوہا نرم ہو جاتا ہے جیسے برگِ گل

مضطرب ہوتے ہیں نیزے جگمگانے کے لئے

کروٹیں لیتے ہیں پرچم لہلہانے کے لئے

جب غلط محسوس ہوتا ہے نظامِ زندگی

برچھیاں دیتی ہیں انساں کو پیامِ زندگی

گونجتی ہے جب کمانوں کے کڑکنے کی صدا

کان میں آتی ہے کلیوں کے چٹکنے کی صدا

اپنے دامن میں لئے ہوتے ہیں کیفِ ابرو گُل

اسلحہ کی کھڑکھڑاہٹ، فوجیوں کا شور وغل

زندگی پر اک نیا رنگِ شباب آنے کو ہے

مژدہ باد! کاروانِ انقلاب آنے کو ہے!

پرِ دۂ محمل

آوارہ گرد:۔

باطنِ ہر ذرّہ میں برپا ہے طوفانِ حیات
کون کہتا ہے کہ ناممکن ہے درمانِ حیات
زندگی کو بارہا دیکھا ہے میں نے بے حجاب
مطرب و ساقی جلو میں، خلد و کوثر ہمرکاب
کھا گیا ہے دہر کو لاانتہا قرنوں کا زنگ
آج تک روئے نگارِ زندگی ہے لالہ رنگ
چاندنی راتوں میں ہے آئینہ آرا زندگی
چار سو پھیلی ہوئی ہے ماہ پارا زندگی
گردشِ دوراں خجل ہے زندگی کے سامنے
سر جھکایا ہے ادب سے گردشِ ایام نے

رقص کرتی ندیوں میں شعر خواں ہے زندگی
دندناتے زلزلوں پر حکمراں ہے زندگی

کاش یہ ضو دے تجھے اپنے چراغِ دور سے
تو رہا محروم اب تک زندگی کے نور سے

پُر سکوں رہ کر کلی اے دوست کھل سکتی نہیں
بے تلوّن عشرتِ جاوید مل سکتی نہیں

گونجتی ہے دشت و صحرا میں نوائے زندگی
چل مرے ہمراہ اے نا آشنائے زندگی!

اسٹیچو (STATUE)

اے خرابِ جستجو! اے تشنۂ کیفِ حیات
کیا کبھی تجھ کو نظر آئی ہے روحِ کائنات

متصل خوابِ پریشاں دیکھتا رہتا ہوں میں
سرد لاشوں کو خراماں دیکھتا رہتا ہوں میں

محورِ آلام ہے، جولانگہِ آفات ہے
ابنِ آدم کی تباہی میں خدا کا ہات ہے

بربط و ساغر جفاکاری کی رو میں بہہ گئے
سنگ و آہن کے جمود آگیں فسانے رہ گئے

سیکڑوں منزل حریمِ آگہی سے دور ہیں
خاکیوں کے روپ میں رِستے ہوئے ناسور ہیں

زندگی کی حسرتِ دیدار تڑپاتی رہی
میری پتھرائی ہوئی آنکھوں میں لہراتی رہی

آہ لیکن دل وہی ہے دل کی ویرانی وہی
ہے تاثر کے جہاں کی حشر سامانی وہی

مضمحل ہے شمعِ محفل، مٹ گئی تابِ گداز
اب نہ پروانوں کے جمگھٹ ہیں نہ اسبابِ گداز

زندگی خود ہے اسیرِ ماہ و سالِ زندگی
کون عریاں دیکھ سکتا ہے جمالِ زندگی!

ہندوستان

یہ بزمِ شعلہ کاری، یہ حریمِ آتش افشانی
یہ قشقے، یہ عبائیں، یہ گرانی، یہ گرانجانی

یہاں اک سلسلہ ہے نفرتوں کی داستانوں کا
رقابت کی خلیجوں کا، عداوت کی چٹانوں کا

یہاں خونی ترانے رقص کرتے ہیں فضاؤں میں
چمکتے ہیں یہاں تخریب کے پرچم ہواؤں میں

یہاں ہر ایک سینے میں ریا کی آگ جلتی ہے
یہاں کی روشنی تاریکیوں کے ساتھ چلتی ہے

یہاں احساس مجروحِ نزاعِ کفر و ایماں ہے
یہاں لیلائے ہستی مضطر و افسردہ ساماں ہے

یہ بت خانے نہیں قبریں ہیں عرفانِ حقیقت کی
یہاں خوں رنگ ہے پوشاک سلمائے شریعت کی

لگا کر وہم کا غازہ یہاں مذہب سنورتا ہے

یہاں شیخِ حرم قرآن کا نیلام کرتا ہے

صدا ناقوس کی اک فتنۂ بیدار ہوتی ہے

یہاں بانگِ اذاں مرّیخ کی پھنکار ہوتی ہے

اثر ہے ان کی روحوں پر خرد کی چیرہ دستی کا

دھواں پھیلا ہوا ہے چار سو فرقہ پرستی کا

یہاں آسودگی اک لفظِ بے مفہوم ہے گویا

مقامِ زندگی سے زندگی محروم ہے گویا

یہاں شبنم کے قطرے مقبرے بنتے ہیں پھولوں کی

تصرف ہیں یہاں آئینہ خانوں میں بگولوں کے

یہاں انسان انساں کا لہو پی کر نکھرتا ہے

سیاہی اور بڑھ جاتی ہے جب سورج ابھرتا ہے

مرے ظلمت کدے پر بارشِ انوار کب ہو گی

خدا جانے کہ اب انسانیت بیدار کب ہو گی!

گم شدہ فردوس

ساقی! مری کھوئی ہوئی فردوس کہاں ہے

وہ ساغرِ بلّور نہ وہ رطلِ گراں ہے

وہ گل ہیں نہ وہ زمزمۂ آب رواں ہے

وہ تو ہے نہ وہ عربدۂ زہرہ وشاں ہے

ہر آنکھ گہربار ہے، ہر قلب تپاں ہے

ساقی! مری کھوئی ہوئی فردوس کہاں ہے

وہ کیف نہیں کفر کی گلبانگ جواں میں

وہ زہد میں عظمت ہے نہ مستی ہے اذاں میں

باقی نہیں آسودگی و امن جہاں میں

کہتے ہیں سکوں جس کو وہ اک جنسِ گراں ہے

ساقی! مری کھوئی ہوئی فردوس کہاں ہے

شاہیں کے لئے ہیچ ہے کرگس کا نشیمن

افسوس کہ خود قافلہ سالار ہے رہزن

لرزاں خس و خاشاک پہ ہے پرتوِ گلشن

اک "دشتِ زبوں" پر چمنستاں کا گماں ہے

ساقی! مری کھوئی ہوئی فردوس کہاں ہے

وہ نغمہ و نکہت ہے نہ خس خانہ و برف آب

اُف گردشِ تقدیر کہ آنسو بھی ہیں نایاب

ہر خار ہے لب تشنہ، ہر اک غنچہ ہے بیتاب

ہر پھول تری سمت بہ حسرت نگراں ہے

ساقی! مری کھوئی ہوئی فردس کہاں ہے

ہر پردہ اسرار ہے اسرار کا غمّاز

ہر نغمہ درماں میں ہے اک درد کی آواز

وہ شوقِ جنوں ریز نہ وہ عشقِ فسوں سا

ہر شے پہ جفا کاریِ آسیبِ خزاں ہے

ساقی! مری کھوئی ہوئی فردوس کہاں ہے

کیوں سرد ہے آویزشِ اہرمن و یزداں

کیوں قلزمِ ایام سے اُٹھتے نہیں طوفاں

مدّت ہوئی خاموش ہے آشوبِ گریباں

قرنوں سے جنوں سینۂ ہستی میں نہاں ہے

ساقی! مری کھوئی ہوئی فردوس کہاں ہے

میرے لئے مہمل ہیں طرب ناک فضائیں

مسموم و شرر بیز ہیں مرطوب ہوائیں

چبھتی ہیں دلِ زار میں کوئل کی صدائیں

گلبرگِ تروتازہ بھی اب شعلہ فشاں ہے

ساقی! مری کھوئی ہوئی فردوس کہاں ہے

ممکن نہیں اب دل میں تماشائے تمنّا
بے نور سی ہے وادیٔ سینائے تمنّا
پژمردہ و مغموم ہے سلمائے تمنّا
ناراض سی لیلائے حیاتِ گزراں ہے
ساقی! مری کھوئی ہوئی فردوس کہاں ہے

ساقی! عجب آزار ہے آزارِ تفکّر
شایانِ تکلّم نہ سزاوارِ تفکّر
شائد ہے یہی "محشرِ بسیارِ تفکّر"
انبارِ تفکّر سے ہر اک سانس گراں ہے
ساقی! مری کھوئی ہوئی فردوس کہاں ہے

خیر و شر

اے امیرِ ہر دو عالم! اے خدائے ذوالجلال!
میں اسیرِ دامِ ہستی اور تو عین الکمال
شمعِ ہستی میں، کہ ہے، ہمرنگِ فانوسِ خیال
ضَو فشاں ہے خیرِ برتر کی شعاعِ پُر جمال
قطرہ قطرہ تیری شخصیّت کا عکسِ بے تکلف
ذرّے ذرّے سے نمایاں ہیں ترے ماضی و حال
زندگی دشوار تھی دنیا میں انساں کے لیے
کارفرما رُوح میں ہوتا نہ گر تیرا جمال
مٹ نہیں سکتی مرے ذوقِ نظر کی تشنگی
پردۂ ظلمات ہو یا چشمۂ آبِ زلال

منجلی تجھ سے ہوا، آئینۂ اسکندری
اے کہ تیری مے سے ہے روشن مرا جامِ سفال

زندگی کیا ہے؟ نسیمِ صبح یا بادِ سموم؟
ساقی و مطرب کی محفل؟ عرصۂ جنگ و جدال؟
کون سی قوت پہ ہے قائم اساسِ آب و گل؟
روز و شب رہتا ہے محوِ رقص طاؤسِ خیال
منکشف ہے رازِ نقشِ ناتمامِ زندگی
کون کہتا ہے کہ محکم ہے نظامِ زندگی!

صدائے غیب

ایک ہے تیرا جنوں زنجیریٔ شاخِ نخیل
تجھ کو کیا معلوم کیا ہے لذّتِ ذوقِ رحیل
کفر سے حاصل ہوا دینِ محمدؐ کو فروغ
آتشِ نمرود میں پوشیدہ ہے باغِ خلیل

خلوتِ غارِ حرا ہے دعوتِ عزم و عمل
بے یقینی میں نہیں ملتا سراغِ جبرئیل

مذہبِ یزداں میں ہو جاتا ہے سلطاں بھی فقیر
غیرتِ فغفور و خاقاں ہیں گدایانِ ذلیل

مومنِ آزاد ہے مانند بحرِ بیکراں
اُس کا دل جامِ رحیق، اُس کی نظر تیغِ اصیل

بے خبر ہیں اس حقیقت سے خدایانِ فرنگ
جلد ہی مٹنے کو ہے "تہذیب" کا نقشِ جمیل

عشق و مستی کا صِلہ ہے عشق و مستی کا مآل
نغمہ زارِ خلد ہو یا چشمہ سارِ سلسبیل

یہ سوادِ رنگ و بو، یہ گنبدِ نیلوفری
میری شانِ کارسازی کی ہے اک زندہ دلیل

خالقِ شر خیر کے آگے جھکا دیتا ہے سر
سطوتِ فرعون ہو جاتی ہے آخر غرقِ نیل!

ہمالہ

(کہسارِ اعظم)

اے ہمالہ! اے درِ محکومیت کے پاسباں!
تیری ہر چوٹی کو حاصل ہے حیاتِ جاوداں
اب کہاں وہ مے پرستی، وہ بہاریں اب کہاں
پائے مسلم میں ہے ناکامی کی زنجیرِ گراں
بندۂ مومن فرنگی بتکدے میں کھو گیا
وہ سحر تک جاگنے والا مسلماں سو گیا
کس قدر ہے تیرا نظارہ تحیّر آفریں
تجھ کو فطرت نے عطا کی ہے قبائے یاسمیں
تیرے آگے جھک رہی ہے آسمانوں کی جبیں
اور تجھ پر سایہ افگن شہپرِ روح الامیں
رفعتِ بامِ ثریّا تیری رفعت میں نہاں
عظمتِ اہرام ہے تیری قدامت میں نہاں

تیرے دامن میں نگارِ آبجو محوِ سرود
پھول اودے، نیلے، پیلے۔ بدلیاں سُرخ وکبود
روز تیری وادیوں میں تازہ چشموں کی نمود
مخزنِ اسرار! اے آئینہ رو! اے زندہ رود!
شاہدِ قدرت ہو نازاں جس پہ وہ زیور ہے تو
اک طلسمی برج ہے یا گنبدِ بے در ہے تو
مائلِ رم خوف سے گلچیں کے ہے روحِ گلاب
لیلیٰ شب لوٹ لیتی ہے متاعِ آفتاب
دہر کی ہر چیز ہے مانند فانوسِ حباب
باغ کی ننھی سی بلبل ہو کہ صحرائی عقاب
اے ہمالہ! پختہ تر ہے تیرا جامِ زندگی
تجھ پر افشا ہو گیا رازِ دوامِ زندگی
یہ نسیمِ بادہ ریز و جنبشِ برگِ چنار
سامنے تیرے نگوں سر گردشِ لیل و نہار
تیری خاموشی پہ قرباں، نور و تابش پر نثار
ماہِ نو کی کشتیٔ سیمیں ہے ستار دل کا وقار

صبح کی دوشیزہ جب اُٹھتی ہے خوابِ ناز سے
نذر لاتی ہے گلوں کی تیرے دامن کے لئے

سرمدی تیری چٹانیں، سرمدی تیرا شباب
تیرے چہرے پر دوامی برف کا سیمیں نقاب
زیب دیتی ہے تجھے زریں کلاہِ آفتاب
دے رہا ہوں میں تجھے "کہسارِ اعظم" کا خطاب

عالمِ برباد میں اک جوہرِ باقی ہے تو
مجھ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ آفاقی ہے تو

برف کے تودوں میں شعلوں کا جہاں پاتا ہوں میں
حلقۂ نمناک کو دوزخ نشاں پاتا ہوں میں
تیرے ہاتھوں میں حوادث کی عناں پاتا ہوں میں
پھر دیارِ ہند میں شورِ فغاں پاتا ہوں میں

میری شاخِ آشیاں ہے برقِ آتش خیز ہے
کیا ترے ساغر میں اب بھی وہ شراب تیز ہے؟

صفحۂ خونیں

کربلائے مقدس

ہے کربلائے مقدس کے ذرے ذرے میں
رباب دل کے لئے آفرینش صدسوز
سوادِ گلشن ماضی میں گرم سیر ہوں میں
نگاہ شوق! مبارک ہو عشرت امروز!

آتشِ نمرود

ابھی ہے ماہ و کواکب کو انتظار حسینؑ
اگرچہ برق بداماں ہے آسمانِ کبود
یزیدیوں کی جفاؤں سے تو ملول نہ ہو
فروغِ عشق کا باعث ہے آتشِ نمرود!

حق و باطل

کشاکشِ حق و باطل سے بے نیاز ہے تو
تری خرد کو گوارا ہے ربطِ شیشہ و سنگ
نہ پوچھ مجھ سے حریفانِ تشنگی کا مآل
ہنوز جلوۂ آبِ فرات ہے بے رنگ!

یقین و عزم

یقین و عزم کتابِ خدا کی تفسیریں
یقین و عزم نیامِ خودی کی شمشیریں
گزر کے دیکھ کبھی کربلا کی منزل سے
تری فغاں کے لئے مضطرب ہیں تاثیریں!

مسلکِ شبیّر

خرد کی نے میں ابھی نغمۂ حجاز نہیں
اسی لئے مے وحدت سے ہے تہی یہ ایاغ
اگر عزیز نہ ہو مجھ کو مسلکِ شبیّر
خدائے عشق! بجھا دے مرے نفس کا چراغ

بہ حریمِ کبریا

تن آساں جوانوں کو ذوقِ سفر دے
فضائیں نئی دے، نئے بال و پر دے

شکوہِ مقامِ سرور و نظر دے
انھیں پھر مجاہد کا قلب و جگر دے

مجھے آرزو ہے بکمالِ جنوں کی
مرے جامِ خالی کو خونِ جگر دے
مجھے جستجو ہے نشاطِ دروں کی
دلِ نغمہ دے یا دلِ نغمہ گر دے

وہی ظلمتیں ہیں، وہی رہ گزر ہے
شبِ زندگی کو نویدِ سحر دے

دعاؤں کو اب تک تلاشِ اثر ہے
دعاؤں کو یا رب مذاقِ اثر دے

کہیں جھونپڑے ہیں کہیں قصر وایواں
بشر کو تمنائے نوعِ بشر دے
جو سورج کی کرنیں ہیں آتش بداماں
تو شبنم کی بوندوں کو سوجِ ثمر دے

رہوں رنگ و بو میں گرفتار کب تک
مرے آشیانے کو برق و شرر دے
لبِ جو و کہسار و گلزار کب تک
مجھے دشت و ویرانۂ پُر خطر دے

وہی ذوقِ تسخیرِ فطرت عطا کر
وہی جوشِ کردار و اوجِ نظر دے
وہی درد و سوزِ محبت عطا کر
وہی برّشِ تیغِ فتح و ظفر دے

ابھی بزمِ امیں میں خاموشیاں ہیں
وہی دل، وہی جذبۂ برق در دے

ابھی دہر پر ظلمتیں حکمراں ہیں
وہی شمعِ کافور و قندیلِ زر دے

بہت تلخ و راحت شکن ہے مئے نو
مجھے ساغرِ قند و شہد و شکر دے

نہیں کوئی تارا اگر ہے تو کم ضو
مرے چرخِ ہستی کو شمس و قمر دے

یونہی مان لوں کیا تری کبریائی
کلاہ و کمر دے، عقیق و گہر دے

جو ممکن نہیں تجھ سے کارِ خدائی
خدایا! مجھے کشورِ بحر و بر دے

احتجاج

مجھے تیری محبت کی قسم ایسا نہ ہونا تھا
غمِ درماں کثیر اور درد کم ایسا نہ ہونا تھا

امیروں کو نصابِ سیم و زر، مفلس تہی دامن
ترا دستِ کرم، ابرِ کرم ایسا نہ ہونا تھا

کہیں دہقان کے سینے پہ ہیں مہریں فاقہ مستی کی
کہیں تختِ سکندر، جاہِ جم ایسا نہ ہونا تھا

کہیں چنگیز کے ہونٹوں پہ موجِ خندۂ رنگیں
کہیں مظلوم کی آنکھوں میں نم ایسا نہ ہونا تھا

جبینِ شوق کو سجدوں سے فرصت ہی نہیں ملتی
کم از کم حسن کا نقشِ قدم ایسا نہ ہونا تھا

ریاکاری کا پرچم لہلہائے خانقاہوں پر
نگوں سر عشق و مستی کا علم ایسا نہ ہونا تھا

ہزاروں سال گزرے، ہے ابھی تک تیری دنیا میں
وہی ہنگامۂ "لا و نعم" ایسا نہ ہونا تھا

لطافت بے کثافت کچھ نہیں مانا، مگر یارب
صنم خانے میں بنیادِ حرم ایسا نہ ہونا تھا

اگر پیدا ہی کرنا تھا مجھے بے حس غلاموں میں
تو پھر میری نوا کا زیر و بم ایسا نہ ہونا تھا

مجھے پاسِ عبودیت ہے لیکن یہ بھی کہنے دے
جہاں تیری خدائی کی قسم ایسا نہ ہونا تھا

اے مردِ انقلاب

دنیا میں گونجتا ہے ترا نعرۂ شباب
جس طرح لالہ زار میں گاتی ہو جوئے آب
اے مردِ انقلاب

اب ہو گئی وہ شوکت و سطوت خیال و خواب
یہ اصل ہے کہ فرع؟ حقیقت ہے یا سراب؟
اے مردِ انقلاب

مسلم ہے قید و بند کی ذلت سے بے نیاز
اِس کے دل و دماغ پہ طاری ہو اضطراب
اے مردِ انقلاب

شمعِ خودی سے کسبِ ضیا کر رہا ہے عشق
فیضِ صدف سے قطرۂ نیساں ہو لعلِ ناب
اے مردِ انقلاب

مرغِ شعور دامِ غلامی میں ہے اسیر
آمادۂ ظہور ہے اب جہل کا عذاب
اے مردِ انقلاب

قابض ہیں روح و ذہن پہ اوہامِ باطلہ
نورِ یقین و عزم سے بے بہرہ شیخ و شاب
اے مردِ انقلاب

بادِ خرد سے مشعلِ کردار بجھ گئی
جیسے ہجومِ ابر میں کھو جائے ماہتاب
اے مردِ انقلاب

طوفاں ہیں، زلزلے ہیں لرزتی ہے کائنات
مومن ابھی ترنگ میں ہے محوِ خواب
اے مردِ انقلاب

شبنم بھی تشنہ کام ہے، سبزہ بھی تشنہ کام
خم خانۂ چمن میں ہے اک شور "لا شراب"
اے مردِ انقلاب

بلبل خزاں کے خوف سے محوِ فغاں رہی
حدِ نظر سے دور ترا اڑتا رہا عقاب
اے مردِ انقلاب

تیرے سکوں سے گردشِ دوراں سکوں پذیر
تو آیۂ حیات کا معنیٔ دیریاب
اے مردِ انقلاب

تیری نظر حجاب و تصور سے ماورا
تیری نظر پہ شاہدِ فطرت ہے بے نقاب
اے مردِ انقلاب

ہے بزمِ زندگی میں وہی تیرگی ابھی
خوابیدگانِ غم کو بتا رمزِ انقلاب!!
اے مردِ انقلاب!

ازل سے تا امروز

شورشِ بادِ خزاں سے پھول مرجھاتے رہے
تیری خونناب شبنم سے وضو کرتی رہی

انجم رخشاں سے گھبراتی رہی تاریک رات
ماہ و انجم کو سحر بے آبرو کرتی رہی

ذہن و دل پر آگ برساتی رہی برقِ جلال
زندگی ذوقِ نظر کی آرزو کرتی رہی

عشق ہول آگیں بیابانوں میں سرگرداں رہا
فطرتِ حسن اہتمامِ رنگ و بو کرتی رہی

آسماں پر سازشیں ہوتی رہیں اس کے خلاف
روحِ انساں عافیت کی جستجو کرتی رہی

آدمی کھاتا رہا جابر مشیت کا فریب
اور مشیت روز خونِ آرزو کرتی رہی

زہد کا خوش رنگ پردہ چاک ہوتا ہی رہا
حجلۂ عصیاں کی یکسوئی رفو کرتی رہی

وہم زائیدہ خدا فرماں روا ہوتے رہے
پتھروں کو بندگی آئینہ رو کرتی رہی

شاعرِ آتش نفس دیتا رہا درسِ عمل
اور غلامی بارشِ جام و سبو کرتی رہی

بارگاہِ عشق

یہ بارگاہِ عشق ہے افسرؔ! بہوش باش

ہر لمحہ کائنات ہے زیر و زبر یہاں

آئینۂ فراق ہے سورج کی ہر کرن

تارے ہیں صبحِ وصل کے پیغامبر یہاں

فرماں روا ہے کون و مکاں پر نگاہِ شوق

ہے ہر اسیر صاحبِ صد بال و پر یہاں

باطن کے انکسار میں روحِ جلیل ہے

غلطاں ہیں فرشِ خاک پہ شمس و قمر یہاں

ہر اشک میں ہزار کواکب ہیں ضو فروش

تابندہ تر ہے ماہ سے داغِ جگر یہاں

ہے قطرہ قطرہ شورشِ طوفاں کا رازدار
ہوتا ہے ذرّے ذرّے میں رقصِ شرر یہاں

رازِ سفر سے کوئی نہیں آشنا ہنوز
بے سود ہے تلاشِ سکونِ خضر یہاں

لالے کا ایک داغ ہے صد مہر در کنار
شبنم کی ایک بوند ہے دُرجِ گہر یہاں

ہے رات دن اجل کے تعاقب میں زندگی
قدموں پہ ہے دعا کے جبینِ اثر یہاں!

سیرِ جہاں

عرضِ مصنّف

غبارِ رہ کو بتاتے ہیں چشمۂ خورشید
نہ پوچھ اہلِ خرد کی جہول سامانی

مری خودی کے صدف میں ہے گوہرِ اخلاص
اسی کا نام ہے سرمایۂ مسلمانی

شرابِ تازہ مرے خُم کدے سے پیتا جا
کہ یہ کرے گی ترے فقر کی نگہبانی!

بمبئی

یہاں مجھے نظر آیا ہے ذرّے ذرّے میں
وہ جبر جس کو طلسمِ تضاد کہتے ہیں

مقامِ خفتہ دلاں، سیرگاہِ اہلِ ہوس
اسی کو لوگ عروس البلاد کہتے ہیں

پیرس

یہ شہر سیلِ حوادث سے بچ نہیں سکتا
مےَ خرد سے ہے لبریز اس کا پیمانہ
تجھے رموزِ نظر سے نہیں ہے آگاہی
فقط فریب نظر ہے یہ آئینہ خانہ!

وینس

وہ شہر جس پہ ہے غالب جمالِ نسوانی
گمانِ بحر ہے جس پر نگاہ کو وہ سراب
مری نظر پہ فاش اسکی سست بنیادی
کہ ہے وادیٔ رقص و سرود نقش بر آب!

لندن

اصولِ زیست توکّل ہے دینِ شیری میں
فرنگیوں کی تگ و دَو تمام روباہی
یہ شہر شہرِ ہوس ہے، نہ کر تلاش یہاں
فغانِ نیم شبی، نالۂ سحر گاہی!

اسکندریہ

نظر بلا کہ میں سمجھاؤں رازِ محکومی
یہی ہے نارِ جہنم کی قہرسامانی

رباب و ساقیٔ و رعبِ سکندری پہ نہ جا
ہے بارگاہِ قلندر رہی قصرِ سلطانی!

بغداد

اگر نہیں ہے ترے دل میں لذتِ آغاز
تو ناگزیر ہے اے دوست خستگیٔ انجام

بجھا سکا نہ شہیدوں کی پیاس آبِ فرات
رہے گا موردِ آفات و مرکزِ آلام!

قرطبہ

سوارِ اشہبِ دوراں ہو جس کا ذوقِ عمل
رہا نہ بزمِ جہاں میں وہ مردِ آفاقی

افسر

یہ شہر دیدۂ مسلم کا نور ہے افسر
یہاں ہیں سطوتِ ماضی کے کچھ نشاں باقی!

صقلیہ (جزیرہ سسلی)

ابل رہا ہے مرے آنسوؤں کا فوارہ
کہ اپنی عظمتِ رفتہ پہ اشکبار ہوں میں
مری نگاہ میں ہے منظرِ طلوع و غروب
خزاں رسیدہ و لب تشنۂ بہار ہوں میں

مدینہ

وہ جس کے زیرِ نگیں تھا ضمیرِ ارض و سما
وہ روحِ فقر، وہ سلطانِ جملہ موجودات
ہے محوِ خواب مدینے میں تاجدارِ ازل
جہاں کو جس نے عطا کی ہے گمرہی سے نجات

کشمیر

بجا کہ خلدِ نظر ہے یہ بزمِ رنگ و نوا
بجا کہ جنتِ ارضی ہے وادیٔ کشمیر
ذلیل فاقہ کشوں کی نہیں ہے گنجائش
یہ شہر وقف ہے افسر برائے شاہ و وزیر!

ترکستان

کمالِ عزم و عمل دیکھ زندہ قوموں کا
فزوں ہیں قسمتِ یزداں سے اُن کی تدبیریں
عروسِ فتح سے ہوتے ہیں ہمکنار وہی
مثالِ برق درخشاں ہیں جن کی شمشیریں
زمانہ جن کو نحیف و نزار کہتا تھا
فلک پہ گونج رہی ہیں اب اُن کی تکبیریں!

روس

ہے ذرّے ذرّے میں تیرا نشیمنِ ابدی
کہ بجلیوں میں بنایا ہے آشیاں تو نے
تری غلامِ حیاتِ غیور و شور انگیز
حقیقتوں کو عطا کی ہیں سرخیاں تو نے
شرارِ آتشِ جمہور شعلہ افگن ہے
بنا دیا ہے بیاباں کو گلستاں تو نے!

بنگال

یہی وہ خطۂ زرخیز ہے جہاں اے دوست
ہر ایک پھول کو ہے شکوۂ کمِ اوراقی
کیا ہے بھوک نے قیدِ حیات سے آزاد
اسی دیار میں ٹوٹا طلسمِ رزاقی!

لاہور

یہاں وہ "صاحبِ اسرار[1]" جلوہ آرا تھا
دیا ہے جس نے غلاموں کو درسِ خودداری
مرا سوال ہے لاہور کے جوانوں سے
کہاں گئی وہ کم آمیزیٔ و کم آزاری؟

آگرہ

اُس آئینے میں جسے ارضِ تاج کہتے ہیں
بغور دیکھ خمِ کاکلِ شبِ مہتاب
سوادِ حُسنِ ازل، جلوۂ خانۂ جبریل
صباحِ غنچہ کشا میں سرورِ فصلِ شباب

[1] اقبال

بہ ایں خمارِ فراواں، بہ ایں نشاطِ کثیر
اسی دیار میں ہے ایک ہستیِ بیتاب!

دہلی

یہ انقلابِ زمانہ ارے معاذاللہ
اب اس دیار میں باقی نہیں وہ زیبائی
یہ شہر مسجدِ جامع پہ ناز کرتا ہے
یہاں ہنوز چمکتی ہے برق سینائی!

احمد نگر

مقامِ مرگ، حریم شرار و برق و سموم
منافقین کے انبوہ، جاہلوں کا ہجوم
اگر یقین نہ ہو آزما کے دیکھ اِسے
یہ شہر علم و ہنر سے ہے مطلقاً محروم!

علّامہ اقبالؒ

بارگاہِ باری تعالیٰ میں

اسرافیل :-

ملائک رقص کرتے ہیں فلک آنکھیں بچھاتا ہے
سوادِ گلشن فردوس میں یہ کون آتا ہے

جبرئیل :- وہ شاعر جس کی جرأت[1] پر خدا بھی مسکراتا ہے

خدا :-

میری خاطر چھوڑ کر آیا جہانِ بے ثبات
عارفِ سرِّ حقیقت واقفِ رازِ حیات
جا درِ جنت پر استقبال کو اے جبرئیل
منتظر ہے اذن کا اک صیرفیٔ کائنات

---

[1] فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک
(اقبال)

اقبال

قبر سے تاریک تر تھی حضرتِ انساں کی رات
میری آہِ سرد نے توڑا طلسمِ شش جہات
آہ یا رب! کیا یہی ہے حق پرستی کا مآل
غیرتِ محمود پر اب طعنہ زن ہے سومنات

خدا:-

ذرّہ ذرّہ ہے ترے سوزِ نوا سے سینہ تاب
کیا زمیں کیا آسماں، کیا برق سوزاں کیا سحاب
اُمّتِ مرحوم کو تو نے دیا درسِ خودی
ہے تری ضربِ کلیمی ملک و ملّت کا شباب
تیرے نعروں سے لرزتا ہے دلِ کوہ و کمر
کانپتی ہے تیری نظروں سے شعاعِ آفتاب
دیکھتے ہیں تجھ کو حیرت سے خدایانِ فرنگ
بجلیاں تیرے جلو میں، رعد تیرے ہم رکاب

تیرے نغموں میں نہاں ہیں معجزاتِ زندگی

موت کا خونی فرشتہ تجھ سے کرتا ہے خطاب

تیری آمد پر چمن میں شوخ کلیاں چیخ اٹھیں

آ رہا ہے محرمِ بیتابیٔ روحِ گلاب

دی گئی آخر جہاں میں تجھ کو تکلیفِ نمود

تو ستاروں کے محل میں تھا ابھی تک محوِ خواب

اقبال :-

اے کہ تیرے نور کا پرتو ہے نورِ آفتاب

پھر عطا کر بندۂ مومن کو ذوقِ انقلاب

تو ہر اک شے سے عیاں ہے چشمِ عرفاں کیلئے

حسنِ فطرت رہ نہیں سکتا کبھی زیرِ حجاب

مادرِ تہذیب کے فرزند مذہب سے نفور

بزمِ مشرق ہے خودی کی موت سے بے رنگ و آب

عشق پر رکھی گئی ماہ وکواکب کی اساس

عقل رہ رہ کر چمک اُٹھتی ہے مانندِ سراب

پھول کا پیراہن چاک، اوس کی ناچیز بوند

یہ حدیثِ عشق ومستی، وہ ضمیرِ لعل ناب

بحرِ بے پایانِ ہستی میں وجودِ بے عمل

ڈوبنے والا سفینہ، ٹوٹنے والا حباب

حکمرانی کون کر سکتا ہے بے تیغ وسناں

تیری دنیا کا خلیفہ اور طاؤس ورباب!

اسباب و علل

ایک دن حضرتِ اقبالؒ سے پوچھا میں نے

کیا ہیں بربادی اقوام کے اسباب و علل؟

یوں گہربار ہوا صاحبِ اسرار و رموز

زندگی بن کے بگڑ جاتی ہے بے ذوقِ عمل

مردِ محکوم کا سرمایہ رباب و طاؤس

اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ "ایک اور غزل"

بندۂ حُر کے لئے زہر بھی ہے آبِ حیات

بندۂ حُر کی شبِ تار میں ہے صبحِ ازل

وہ لرزتا ہے عناصر کی غضبناکی سے

اس کی تدبیر سے قدرت کے ارادوں میں خلل!

سورج کی آواز

اب کہاں وہ جلوہ گاہِ آدمِ یزداں صفات
سرزمینِ مار و کژدم بن گئی ہے کائنات
میری کشتی نیل کی موجوں پہ لہراتی رہی
نیل کی موجوں پہ لہراتی رہی۔ گاتی رہی
ہے مرا سوزِ دروں آئینۂ صبحِ نشور
باطنِ اہرام سے پھوٹا ہے مثلِ سیلِ نور
میں نے دیکھا ہے قلوپطرہ کے سینے کا گداز
جوئے شیر و ناقۂ لیلےٰ و گیسوئے ایاز
میں نے دیکھے شورشِ باطل کے طوفانِ عظیم
ضربتِ شمشیرِ خالدؓ، رزمِ فرعون و کلیمؑ
میں نے دیکھی سطوتِ ضحاک و کسریٰ خاک پوش
میری دنیا ماورائے عالمِ فردا و دوش

میں نے دیکھا ریگ زارِ کربلا کو برق پاش
چلچلاتی دھوپ میں وہ پھول سے بچے کی لاش
میں نے دیکھی آتشِ ہنگامۂ بدر و حنین
یاد ہے مجھ کو ابھی گل کاریٔ خونِ حسینؑ
میری کرنیں خندہ زن ہیں ظلمتِ ایام پر
بارہا طیبہ کے میناروں پہ گذری ہے سحر
میں نے دیکھا ہے محمدؐ کا جمالِ جاوداں
میرے ہم پہلو ہیں صدیوں سے زمین و آسماں
میں نے دیکھے ٹمٹماتے عشق و مستی کے دیے
خانقاہوں میں نظر آئے ہیں کتنے بھیڑیے
کھا گئی آخر نسیمِ صبح کو بادِ سموم
یہ سلگتے شہر، یہ خونی درندوں کا ہجوم
زلزلے جنتی رہے گی تابہ کے بوڑھی زمیں
ہیں خدا کی مملکت میں کتنے ابلیسِ لعیں

کتنے ساغر مے کشوں کے خون سے لبریز ہیں

ہیں یہاں کتنے ہلا کو! کس قدر چنگیز ہیں!

روح سے محروم ہیں لا انتہا پشمینہ پوش

کتنے ڈاکو ہیں جہاں ہیں! کس قدر بردہ فروش!

آہ یہ شیخ و برہمن، یہ پجباری، یہ امام

عِصمت و ایماں کے تاجر، دین و دولت کے غلام

کس قدر سیلاب آئے، بجھ گئے کتنے کنول

یہ زبانِ آتش و آہن! یہ شیشے کے محل!

بجلیوں کا گیت کب تک رنگ و بو کے ساز پر

چومتی ہے سنگ ریزوں کی جبین موجِ گہر

زندگی کب تک رہے گی موت کی آئینہ دار!

تابہ کے ہوتا رہے گا نور ظلمت پر نثار

متصل چلتے رہیں گے دل پہ نشتر تابہ کے!

نوجواں کلیاں رہیں گی خاک بر سر تابہ کے!

تا بہ کے ٹکرائیں گے افلاک سے آہوں کے تیر

تا بہ کے شعلے رہیں گے برف زاروں میں اسیر!

تا بہ کے گلشن میں کانٹوں کا علم لہرائے گا!

وقت کب تک عیش خانوں پر لہو برسائے گا!

تا بہ کے مظلوم سیارے رہیں گے پُر شگاف!

روشنی پر تیرگی کب تک چڑھائے گی غلاف!

قصرِ شاہی کے زر افشاں، لالہ گوں محراب و طاق

تیشۂ جمہور کا کب تک اُڑائیں گے مذاق!

جام و مینا میں کہاں تک زہر گھولا جائے گا!

برگِ گُل کو تا بہ کے کانٹے پہ تولا جائے گا!

کاش ہو جاتا مقامِ آدمی مجھ پر بھی فاش

مجھ کو اس دنیا میں قرنوں سے ہے انساں کی تلاش

زندگی کا شعلۂ جولاں نظر آتا نہیں

اس خراب آباد میں انساں نظر آتا نہیں!!

فطرتِ آدم

نگوں ہے پرچمِ اسکندری و دارائی
حریفِ صور گداؤں کی بے نوائی ہے
بدل چلا غمِ بے چارگی سے نازِ عروج
عروجِ خاک پہ تقدیر مسکرائی ہے
نیا زمانہ ہے اے دوست انقلابِ باقی
ہوا میں آگ ہے، کلیوں میں برق زائی ہے
پڑے ہوئے ہیں دماغوں پہ جہل کے پردے
یقین و کفر کی ظلمت دلوں پہ چھائی ہے
یہ سُرخ سُرخ فضائیں، یہ شعلہ گوں کرنیں
نگارِ صبحِ فنا کا پیام لائی ہے
جہاں میں خاک بسر ہیں صداقتیں کتنی
ضمیرِ عصمت و ایماں! تری دہائی ہے

حیات نالہ کناں ہے ازل سے تا امروز
اگر یہی ہے خدائی تو کیا خدائی ہے
یہ حسرتوں کے جہنّم، یہ رنگ و بو کے مزار
بشر نے آج خدا سے شکست کھائی ہے
ہنوز خواب پریشاں ہے راحتِ منزل
وہی "جنوں" ہے، وہی رنجِ نارسائی ہے
نہ کر تلاش یہاں زندگی کے گل خانے
کہ فصلِ گل میں شگوفوں کو موت آئی ہے
مری صباحِ وطن کی لطافتوں پہ نہ جا
کہ ایک ایک کرن خون میں نہائی ہے
مرے دیار پہ نفرت کی رات ہے طاری
خلوص ہے نہ محبت کی روشنائی ہے
ہر ایک ذرّہ ہے آتش کدے چھپائے ہوئے
کھڑی ہے "فطرتِ آدم" نقاب اُٹھائے ہوئے!

اِنقلاب

آنسوؤں میں پھر جھلکتا ہے لہو
آہ یہ ٹوٹے ہوئے جام و سبو

زلزلوں سے تھرتھراتی ہے زمیں
پُرشکن ہے رہ گزاروں کی جبیں

بُجھ گئے عشق و بصیرت کے کنول
ہیں فنا کے رحم پر دشت و جبل

کارواں گمراہ، راہیں پاشکن
یہ غلاموں کے سم آلودہ کفن

خون ٹپکاتی رہی شاخِ گلاب
کھو گئے ظلمت میں کتنے آفتاب

قہقہے شورِ فغاں میں ڈھل گئے
سوز و عرفاں کے نشیمن جل گئے

مٹ گئیں رنگینیاں، رعنائیاں
ہیں بہر سو موت کی پرچھائیاں

ابر پارے خون برسانے لگے
معبدوں میں ناگ لہرانے لگے

ہو گیا ویران فردوسِ خیال
اب کہاں احساس میں نورِ جمال

زندگی نفرت کی جانب مُڑ گئی
بوئے گل بن کر محبت اُڑ گئی

اک تلاطم ہے دلِ غمناک میں
مل گئے کتنے شگوفے خاک میں

یہ سیاہی نا سزا اوہام کی
رک گئی ہیں گردشیں ایام کی

آندھیوں سے جاگ اٹھے خارزار
مضمحل ہیں چشمہ سار و جوئبار

تیرگی کی رو میں سورج بہہ گئے
زمزمے خاموش ہو کر رہ گئے

یہ اندھیری رات اور خوابِ سحر!
ہے مشیّت خندہ زن انسان پر

روز افزوں شورِ ناقوس و اذاں
آگ کا طوفان، خاکستر، دھواں

ہو گئے کتنے حوادث بے نقاب
انقلاب! اے انقلاب! اے انقلاب!

دو مُسافر

رواں ہیں شاہرہِ زندگی پہ دورہ گیر
گدائے کاسہ بدست و فلک مدار امیر

امیر دل میں ہزاروں کنول جلائے ہوئے
گدا بہ حالِ پریشاں نظر جھکائے ہوئے

وہ رنگ و نور کی دنیا، حریمِ سرو و سمن
یہ کلفتوں کا بیاباں، جراحتوں کا چمن

اِدھر ہے قلبِ حزیں، اشک بار و خاک بسر
اُدھر کلاہ کے طرّے پہ رقصِ لعل و گہر

نظر نظر میں اُدھر خندۂ سراجِ منیر
اِدھر ہے ظلمت و نکبت کی خوف زا تصویر

اُدھر دماغ میں کیف و طرب کا سیلِ گراں
غبارِ راہِ تمدّن کی مشعلوں کا دھواں
اِدھر ہے قلزمِ ادراک ساکن و پایاب
اُدھر خیال میں ضَو ریز سیکڑوں مہتاب
اِدھر ببول کے کانٹے، اُدھر گلاب کے پھول
اِدھر یہ بے اثری اور اُدھر وہ حسنِ قبول
اُدھر جلو میں ہے تنویرِ مہر و طلعتِ ماہ
اِدھر ہے قبر کی پُر ہول تیرگی ہمراہ
اُدھر حیات کی رنگینیاں بہار افشاں
اِدھر ممات کی بے کیفیاں شرار افشاں
اُدھر ہے قاقم و سنجاب و پرنیان و حریر
اِدھر شباب ہے بوسیدہ پیرہن میں اسیر
اُدھر ہے شیب کی ریشِ سپید "زہر آلود"
اِدھر سموم خزاں ہے بہار کی مسجود

نہ پوچھ گردشِ دوران کی فتنہ سامانی
جُھکا رہا ہے شبابِ غیور پیشانی!
حضورِ زاغ ہے قمری فسانہ خواں گویا
ذلیل خار ہے نسریں پہ حکمراں گویا
بہت غمیں ہوں مشیّت کے ان قرینوں سے
لڑا رہی ہے چٹانوں کو آبگینوں سے
یہ شامِ یاس، وہ صبحِ مراد کیا معنی؟
بتا! بتا! یہ طلسمِ تضاد کیا معنی؟
تری زمیں سے، ترے آسماں سے باز آیا
جہاں یہی ہے تو میں اس جہاں سے باز آیا!

دُوزَخ

تیرے دُوزخ کی یہ فردوس نمائی کب تک
چھا گیا کتنے شگوفوں پہ تباہی کا غبار
کتنے سورج ہیں زمانے میں اندھیرے کا شکار
ذرہ ذرہ ہے یہاں صدق و صفا کا مدفن
حسرتیں بیچتی پھرتی ہیں شہیدوں کا کفن
ابھی برپا ہے وہی انجمنِ اہلِ کتاب
کارفرما ہیں ابھی میری وشاہی کے سراب
دشت بہتر ہے ترے ان چمنستانوں سے
باز آیا میں حقیقت کے نہاں خانوں سے
کھا گئی بادِ خزاں کتنے سمن زاروں کو
تیز کرتی ہے اجل یاس کی تلواروں کو

کس قدر چاند اُجالے کے لئے رُوتے ہیں
اپنے ہر داغ ہیں ناسور لئے ہوتے ہیں
کب سے خاموش ہیں عرفان و صداقت کے چراغ
عرش پر نقرۂ و نیلم کے خداؤں کا دماغ
زندگی ہو گئی تبدیل گراں جانی میں
موت رقصاں ہے کلاہوں کی زر افشانی میں

امن و اخلاص کو انسان ترستا ہی رہا
آگ بڑھتی ہی رہی زہر برستا ہی رہا
رگِ احساس پہ چلتے رہے نشتر اب تک
عشق و ادراک کے پرچم ہیں نگوں سر اب تک
روزِ روشن کے جلو میں ہیں اندھیرے کتنے
بن گئے قافلہ سالار لٹیرے کتنے

دین و دولت کے صنم نسل و سیاست کے صنم
یہ فلاکت کے بیاباں، یہ امارت کے صنم

کارواں خاک بسر، شعلہ چکاں راہ گزار
دیکھ ہر موڑ پہ وجدان و بصیرت کے مزار
یہ تمدّن کے پجاری، یہ قدامت کے امام
یہی دنیا ہے تو یارب تری دنیا کو سلام
لہلہاتے ہی رہے جہل و قیادت کے علم
بھوک کھاتی رہی بکتی ہوئی عِصمت کی قسم
تو نے آدم کو دئے خلد و جہنّم کے فریب
کبھی تسنیم کے دھوکے، کبھی زمزم کے فریب
یہ خدائی ہے تو بندا! خدائی کب تک!

فردوس

آہ یہ عالمِ ہستی، یہ جہانِ تگ و تاز
صرف اک شورشِ پنہاں نہ حقیقت نہ مجاز
اشک افشاں ہے سحر، پھول ہیں مرجھائے ہوئے
سیکڑوں ناگ ہیں احساس پہ لہرائے ہوئے
یہ شگوفے، یہ شگوفوں کے سلگتے ہوئے راگ
صبح نے لوٹ لیا کتنے ستاروں کا سہاگ
میری آہوں میں ہیں جذبات مدفن کتنے
جل گئے سرد ہواؤں سے نشیمن کتنے

یہ اسیرانِ قفس اور یہ رودادِ چمن
نظر آتا ہے مجھے خلدستاں ہی میں کفن

اب کہاں ہے وہ مری انجمن سوز و ثبات
کتنے تابوت اٹھائے ہوئے پھرتی ہے حیات
جلوہ آرا ہیں ابھی دانش و عرفاں کے سراب
ہیں وہی کفر کے دھوکے، وہی ایماں کے سراب
وہی راہیں، وہی رہرو، وہی فریادِ جرس
"فصل گل" مثلِ شرر ایک نفس یا دو نفس
کتنی کلیاں ہیں کہ محرومِ تبسّم ہیں ابھی
وہی افلاس و امارت کے تلاطم ہیں ابھی
لالہ زاروں میں وہی آگ فروزاں ہے ابھی
زندگی شعلہ وش و سوختہ ساماں ہے ابھی
وہی تاریکیٔ اوہام وہی مشعلِ طور
عصمتیں نوحہ کناں روحِ صداقت کے حضور
یہ غلامی کے شبستاں یہ اجالوں کے مزار
کھیلتی ہے ابھی ظلمت مہ و انجم کا شکار

اب نہ وہ نغمۂ تخلیق، نہ وہ ذوقِ خراش

دوشِ گیتی پہ یہ انسان کی سڑتی ہوئی لاش

چار سو یاس کی اک برق سی لہراتی ہے

زیست کچھ اور شفق رنگ ہوئی جاتی ہے

ڈوب کر قلزمِ ہستی میں ابھرنا ہے مجھے

موت کی وادیِ خونیں سے گزرنا ہے مجھے

ابھی باقی ہے وہی کشمکشِ کفر و یقیں

آہ اے دوست جہنم ہے یہ فردوس نہیں

چھوڑ دو تشنۂ مضراب مرے سازوں کو

بند کر دو مری فردوس کے دروازوں کو!

سرودِ مے کدہ

کل گا رہا تھا مطربِ مے خانہ یہ غزل
ہر جام جامِ جم ہے یہاں، جامِ جم کی خیر
ہر ذرہ ہے کشاکشِ ہستی کا نوحہ گر
سلمائے ہست و بود کے نقشِ قدم کی خیر
کاخِ سپہر برق فشاں، شعلہ خو زمیں
کشتِ خزاں رسیدہ و ابرِ کرم کی خیر
نازاں ہے اپنی ضربتِ کاری پہ بت شکن
یارب! دیارِ آذر و بیت الصنم کی خیر
تجھ کو خبر نہیں کہ ہے خود دشمنِ حرم
صوفی، جو مانگتا ہے متاعِ حرم کی خیر
افسردہ کوہسار ہیں، پژمردہ لالہ زار
اے گیسوئے بہار! ترے پیچ و خم کی خیر

فطرت بھی بے قرار ہے انساں بھی بے قرار
اِس بربطِ حیات کے ہر زیر و بم کی خیر
اب آسماں نورد ہے قندیلِ زر کی لَو
بزمِ نشاط و مرکزِ تیغ و علم کی خیر
اب معرضِ ورود میں ہے روزگارِ نَو
رودِ فرات و دجلہ و کوہِ اضم کی خیر
یہ ہمرہانِ سُست عناصر، یہ تیرگی
منزل رسی کا شوق نہیں "دم قدم کی خیر"
میرے جنوں پہ فاش ہے لطف و کرم کا راز
حسنِ جفا سرشت کے لطف و کرم کی خیر
ملّا خموش، سر بگریباں ہے برہمن
ایماں فروز مشعلِ دیر و حرم کی خیر
ابلیسیت ہے آدمِ خاکی پہ حکمراں
اس روحِ کائنات کے جاہ و حشم کی خیر!

ایک خواب

کل شاعرِ مشرق نے کہا خواب میں مجھ سے
افسوس کہ مومن ہے غلامی پہ رضامند
کھلتا نہیں یہ راز کہ اے بندۂ مجبور
تو صاحبِ لولاک ہے یا دانۂ اسپند
کیا عالمِ تدبیر تجھے راس نہ آیا
کیوں تیری خودی ہو گئی تقدیر کی پابند!
ہر حال میں محکوم ہے، مغموم ہے، معذور
تدبیر سے خورسند، نہ تقدیر سے خورسند
تو کشورِ اجسام کی حکومت کا سزاوار
کیوں تجھ پہ زمیں تنگ ہے اے مردِ ہنرمند

آغوشِ صدف جس کے لئے وا ہو وہ قطرہ
رکھتا ہے نظر میں مہ و پروین کو نظر بند

لیتا ہے ستاروں سے خراج اپنے جنوں کا
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ سمرقند

شاہیں کے لئے تنگ ہے یہ وسعتِ افلاک
پابستہ ہے شمشاد ہے گلزار میں پربند

غمگین نہ ہو پژمردگیِ لالہ و گل سے
تخریب ہے اس دہر میں تعمیر کی مانند

"معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ حرم خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز!"

اقبالؒ

غلامی

تو حلقۂ محدود میں نا محرمِ اسرار

ہیں واقف و دانندۂ احوال و مقامات

ہے تیری نگاہوں میں نہ وجدان نہ برہان

آ تجھ کو بتاؤں میں غلامی کی کرامات

اک جلوۂ بے رنگ تنک تاب و تنک ظرف

اک ذوقِ عمل گم شدۂ سیلِ روایات

سرمایۂ محکوم ہے، مجبوری جاوید

مجبوریِ جاوید سراپردۂ آفات !

فرمودۂ خضر

کل ساحلِ دریا پہ کہا خضر نے مجھ سے
اے بندۂ آزاد! ذرا دیر ٹھہر جا

معلوم نہیں تجھ کو خبر کیا ہے نظر کیا
دنیائے جنوں سے صفتِ برق گزر جا

پُرشور گھٹائیں ہیں اگر تیرا نشیمن
صحراؤں کے تپتے ہوئے سینے میں اُتر جا

اللہ کی رحمت سے نہ مایوس ہو مومن
وہ نور جدھر تجھ کو بُلاتا ہے اُدھر جا!

ہدیۂ اشک

ساقی کے اصول توڑ ڈالے ۔۔۔ رندوں کو اب اہرمن سنبھالے
عنقا ہوئے سر بہ مہر شیشے ۔۔۔ خالی ہیں شراب سے پیالے

ہر باغ میں جشنِ رنگ و بو ہے ۔۔۔ شبنم سے دُھلے ہوئے ہیں لالے
فطرت ہے تری خودی کے بس میں ۔۔۔ اُٹھ اپنی خودی کو آزما لے!

ہیں "کیفِ نظر" سے ناشناسا ۔۔۔ یہ میری "نظر" پہ ہنسنے والے
ملتا نہیں دینِ آدمیت ۔۔۔ اور عام ہیں مسجدیں اٹھوا لے!

چاہے تو کرے زغن کو شاہیں ۔۔۔ چاہے تو پہاڑ چیر ڈالے
ہمت ہے وہ چیز جس سے اکثر ۔۔۔ کھلتے ہیں "درِ اثر" کے تالے!

تا چند اسیرِ کم نگاہی! کب تک یہ فلک شگاف نالے!
تدبیر سے کام لے خدارا! تقدیر کو دوش دینے والے!

ہلچل سی زمیں سے آسماں تک ہر سمت رواں لہو کے نالے
اُس شخص کو جلد بھیج یارب جو اس ترے کھیل سے بچالے!

اب عزمِ سفر کہاں سے لاؤں دل سرد ہے پاؤں میں ہیں چھالے
لے جام ہے آنسوؤں کا تحفہ او میرے وطن کو جانے والے!

بانگِ مشرق

ہے یاد مجھے وہ رات اب تک — وہ محشرِ کائنات اب تک

تارے تھے فلک پہ لرزہ برتن — تھا موم پہ اعتبارِ آہن

پھیلا ہوا چار سو اندھیرا — ہر ذرّے پہ بےبسی کا ڈیرا

گِھر گِھر کے گھٹائیں آ رہی تھیں — سَن سَن کی صدائیں آ رہی تھیں

ہستی میں تھے نیستی کے انداز — افلاک سے آ رہی تھی آواز

"ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے"!

لیکن مجھے کچھ خبر نہیں تھی — ساقی کی نگاہ دل نشیں تھی

مَیں جانبِ مے کدہ رواں تھا — میرے لئے دہرِ لامکاں تھا

اک محورِ سوز و ساز تھا میں — ماحول سے بے نیاز تھا میں

الہام کی رَو میں گنگناتا ہر گام پہ مستیاں لٹاتا

پہنچا جو سرِ حریم ساقی (ساقی پہ نثارِ عمرِ باقی)

صہبائے کہن گلابیوں میں رقصاں تھی بے حجابیوں میں

تھے میز پہ بے شمار ساغر لبریز و خمر و شکار ساغر

اک مستِ شباب گا رہی تھی

گویا مئے ناب گا رہی تھی

نظامِ ہستی کی آرزو ہے تو سن مرا حرفِ محرمانہ

دیارِ برق و شرر ہے دنیا، نہیں گلوں کا نگارخانہ

جو ناشناسِ گدازِ دل ہے، اسیرِ زندانِ آب و گِل ہے

مجھے یقیں ہے نہ ہو سکے گا وہ فیض یابِ مئے مغانہ

بدل گئیں فتنۂ غلامی سے زندگی کی تمام قدریں

نہ اب وہ افکارِ قدسیانہ، نہ اب وہ کردارِ قاہرانہ

نہ آئے دل میں ہراس باطل، فریبِ نغمہ زارِ ساحل

اگرچہ کفِ دہن میں موجیں! اگرچہ طوفاں ہے بیکرانہ

خودی کی پوشیدہ قوتوں سے جہاں کو تسخیر کر رہا ہے
دماغ جس کا ہے شعلہ پرور، نگاہ جس کی ہے عارفانہ
اگرچہ صدیاں گزر چکی ہیں جلالِ فطرت کے حادثے کو
حیات دہرا رہی ہے اب تک وہی تب و تاب کا فسانہ
چراغِ خاور کی روشنی میں حقیقتیں بے نقاب ہوں گی
عروسِ شب کی حسین زلفوں سے جھانکتا ہے نیا زمانہ
یہ کائنات اُس کی شان و شوکت کو حیرتوں سے دیکھتی ہے
وہ جس کو حق نے عطا کیا ہے سرورِ جذبِ قلندرانہ
صباحِ منزل طلوع ہوگی کبھی اِسی خاکِ رہ گزر سے
کرو فراہم کچھ اور تنکے کہ نامکمّل ہے آشیانہ
نگارِ ہستی ہے رقص فرما جبال و صحرا کی وسعتوں میں
کبھی سراغِ نگارِ ہستی نہ پاسکے کا رہینِ خانہ
ہوائے محکومیت نے برفا دیا لہو اِس کی غیرتوں کا
سوادِ مشرق میں بھی خدایا بدل سکے گا کبھی زمانہ!!

آثارِ سحر

مرّیخ :-

پیکرِ شورش و ہنگامہ و سرتابی ہوں
کوئی نوری کوئی ناری ہی نہیں دولابی ہوں
یورشں و طنطنہ و جور و جفا میری سرشت
مَیں جو چاہوں تو جہنّم میں بدل جائے بہشت
اک اشارے میں پہاڑوں کی جڑیں ہل جائیں
ناگہاں مشرق و مغرب کے سرے مل جائیں
طرفۃ العین میں گر جائیں فلک بوس محل
میری سانسوں میں فنا میری نگاہوں میں اجل
دشمنی ہے مجھے شاداب سمن زاروں سے
کانپ اٹھتی ہیں چٹانیں مری پھنکاروں سے

خس و خاشاک کو دی سطوتِ آہن میں نے
پھونک ڈالے ہیں گناہوں کے نشیمن میں نے
میری تابش سے خجل زہرہ و مہر و پروین
تیرے بے جان ستاروں میں اُجالا ہی نہیں
مجھ سے ہے رعشہ براندام دلِ کوہ و کمر
مہرِ دریوزہ گری ہے ترے پیمانے پر
شعلہ افشان در جز خواں مری برنائی ہے
میں نے ہر شے کو مٹانے کی قسم کھائی ہے

ماہتاب:۔

اُف ترا جوشِ جنوں، اُف تری آتش نگہی
دہر جلتا ہی رہا، آگ بھڑکتی ہی رہی
خاک پر خوں کے بہائے ہیں سمندر تو نے
باغ ویران ہیں، مے خانے ہیں سُونے سونے

وہ جو ہر ذرّے پہ یک گونہ قضا طاری تھی
تیرے پُرسوز عناصر کی شرر باری تھی
زندگی آنکھ سے مستور ہوئی جاتی تھی
منزلِ امن ویقیں دُور ہوئی جاتی تھی
شکر، صد شکر کہ گردش میں ہے پھر جامِ سفالؔ
رو بہ کار آ ہی گیا میری شعاعوں کا جمال
باگ ہے قہر و ہلاکت کی ترے ہاتھوں میں
جنّتِ کیف و سکوں میری خنک راتوں میں
مشعلِ مہر و محبت مری تابندہ جبیں
تجھ سے نالاں ہے فلک، تجھ سے پریشاں ہے زمیں
اے کہ اِس ہیبت و اجلال پہ مغرور ہے تو
سینۂ چرخ پہ رِستا ہوا ناسور ہے تو
قلبِ نوخیز و تمنائے جواں بخشوں گا
میں سِسکتی ہوئی دنیا کو اماں بخشوں گا!

از خویش بروں آ

چمن میں آبِ شبنم سے وضو کر
نظر کو بے نیازِ رنگ و بو کر
خودی ہے حاصلِ بزمِ دو عالم
دو عالم میں خودی کی جستجو کر!

ہزاروں بجلیاں تیری نظر میں
ضیا خورشید کی تیرے شرر میں
مگر افسوس تیری کم نگاہی
اُلجھ کر رہ گئی شام و سحر میں

اگر وہ آرزو باقی نہیں ہے
اگر وہ جستجو باقی نہیں ہے
اگر تجھ کو گوارا ہے اسیری
تو میں کہتا ہوں تو باقی نہیں ہے!

ترے لب پر زمانے کا گلہ ہے
ابھی گمراہ تیرا قافلہ ہے
نظر پیدا اگر اس دہرِ کہن میں
یہی میری نواؤں کا صلہ ہے

خودی گنجینۂ علم و ہنر ہے　　خودی سے آدمی صاحب نظر ہے
صدف ہی تو، خودی جوہر ہے تیرا　　صدف کی آبرو کیا ہے؟ گہر ہے

تجلّی سے دلِ شمس و قمر چاک　　قبائے زندگانی چاک در چاک
میں پھر سازِ خودی پر نغمہ زن ہوں　　نہ ہو جائیں ستاروں کے جگر چاک!

وہ شورِ ہائے و ہُو باقی نہیں ہے　　وہ ساقی، وہ سبو باقی نہیں ہے
مسلّط ہے خزاں صحنِ چمن پر　　رگِ گل میں لہو باقی نہیں ہے

پامی آئی

وادیٔ شب سے جب عروسِ قمر
گنگناتی ہوئی گزرتی تھی
چاک ہوتا تھا پردۂ ظلمت
ایک ننھی کرن اُبھرتی تھی
یاسمن کی سفید کلیوں پر
تیتری آکے رقص کرتی تھی

لیکن اب یہ پُرانی بات ہوئی
نہ وہ ساقی نہ وہ صدائے رباب
چار سو تیرگی مسلّط ہے
ظلمت افشاں ہے مشعلِ مہتاب

کوئی جورِ خزاں سے بچ نہ سکی
ہر کلی شاخ پر ہے پژمردہ
اب کہاں وہ حسین تصویریں
ذرّہ ذرّہ خموش افسردہ

اِس جہاں کی ہر ایک چیز افسر
یہ فلک، یہ چمن، یہ ویرانہ
دے چکی ہے مشیّتوں کے حضور
خونِ دل کا "حقیر نذرانہ"
ایک لمحے میں ٹوٹ جاتا ہے
پھول کا ہفت رنگ پیمانہ
ختم ہوتا ہے ایک لحظے میں
رنگ و بو کا طویل افسانہ

غم سے کس کو نجات ملتی ہے
صبحِ نوروز بھی ہے شامِ ملال
عہدِ گل کیا ہے؟ اک فریبِ نظر!
اک فریبِ نظر! طلسمِ خیال!
موت کا سرد ہاتھ بڑھتا ہے
چھین لیتا ہے زندگی کا جمال

جاوداں دن ہے اور نہ رات یہاں
اک تغیّر کو ہے ثبات یہاں!

نظرئے

مستیوں پر آ چکی ہے بادہ افشاں زندگی
بے نقاب اُس کا رُخِ مینا شکن ہونے تو دے

خود بخود کھل جائیں گے اے دوست اسرارِ حیات
فطرتِ غم کو شریکِ انجمن ہونے تو دے

چارسو منصور ہی منصور آئیں گے نظر
اہتمامِ دعوتِ "دار و رسن" ہونے تو دے

آ چکا ہے صوفیوں کے نام فرمانِ طرب
خانقاہوں کی جبینیں پُرشکن ہونے تو دے

آدمی اُلفت کی منزل تک پہونچ ہی جائے گا
دشمنی کے راستے پر گام زن ہونے تو دے

کہہ رہا ہوں مدتوں سے میں حدیثِ رقص و رنگ
آج اک افسانہ بعنوانِ وطن ہونے تو دے

ساغر و مینا کے نغمے بھی سُنائے جائیں گے
انجمن میں ذکرِ شمشیر و کفن ہونے تو دے!

زندگی اور خودی

خودی کو "ذات" کا عرفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خودی حقیقتِ عریاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

نہ پوچھ مجھ سے وہ راحت جو اضطراب میں ہو
تو مثلِ انجمِ رخشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہو شعلہ بار کہ دنیا ہے تودۂ خاشاک
تری خودی شرر افشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خرد ہے لذّتِ ایماں کے ذکر سے بیزار
حیات لذتِ ایماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

تو، جس کی سعی سے تاباں ہے کوکبِ تقدیر
فروغِ عالمِ امکاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خودی کی ضرب سے لرزاں ہے کائنات تمام
خودی کے بحر میں طوفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بہ فیضِ سوزِ خودی تیری زیست کی راتیں
حریفِ صبح زرافشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

تجھے خبر نہیں، کیا ہے حیاتِ شعلہ مزاج
رگوں میں شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خودی کا زخمہ ہے مضرابِ سازِ کون و مکاں
خودی کا ساز غزل خواں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ترے "جمال" کی اس پر اساس ہے اے دوست
تو اپنے دل کا نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

کمالِ عشق ہے ذوقِ نظر کی سیرابی
یہاں تجلّیٔ فاراں نہیں تو کچھ بھی نہیں

وجودِ قطرۂ نیساں سے ہے صدف کی نمود
صدف میں قطرۂ نیساں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مری نواؤں سے لرزاں ہیں تارِ عودِ حیات
میں زندگی کا حُدی خواں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

مومن

لاہوت میں خوابیدۂ انوار ہے مومن
ناسوت کا ہنگامۂ بیدار ہے مومن

وہ ضرب جو خیبر شکن و برق فشاں تھی
اس ضربت کاری کا پرستار ہے مومن

ہر لحظہ سبک سیر و جہاں گیر و جہاں تاب
ہر لمحہ فسوں ریز و فسوں کار ہے مومن

ہم پایۂ کردار نہ پرویز و چنگیز
بے نیزہ و شمشیر بھی خونخوار ہے مومن

افکار میں پیوندِ نہاں خانۂ جبروت
قرآن کا مفہومِ شرربار ہے مومن

پھر گردشِ افلاک ہے آمادۂ پیکار

افلاک سے پھر برسرِ پیکار رہے مومن

پھر عالمِ ایجاد میں ہے قحطِ محبت

پھر جنسِ محبت کا خریدار رہے مومن

اربابِ جلالِ ازلی اُس کی نظر میں

اللہ کا اک شیرِ جگردار رہے مومن

اس مردِ قلندر کی خودی اصل خدائی

صاحب نظراں! عقدۂ دشوار رہی مومن!

ضمیرِ کائنات

سوال

میرے آگے سرنگوں تھی رفعتِ چرخِ بریں
اب کہاں وہ قہرمانی قوتِ صدق ویقیں
ہے مرا جوشِ جنوں مانندِ ابرِ آخریں
ورنہ ہر اک پھول پر رقصاں ہی موجِ گوہریں
یاد آیا ہے کہ تھا میں دو جہاں کا تاجدار
گونجتی تھی عرش پر میری نوائے آتشیں
اپنے مرکز سے ہٹا دیتی تھی میری چشمِ شوق
سختیِ خارا ہو یا رنگِ عبائے یاسمیں
وہ تحیر ناک ماضی کا عظیم الشان دور
آہ سب کچھ تھا بفیضِ سطوتِ دینِ مبیں
پردۂ سیمینِ دل پر یوں ابھرتے تھے نقوش
جس طرح گلشن میں آتی ہے شعاعِ اولیں

کوہسار و دشت و مہر و ماہ تھے جس کے غلام
اب وہی سلطانِ عالم ہے گدائے رہ نشیں
روز و شب ہے مجھ پہ مستولی اک اضمحلال سا
میری ہستی کیا ہے گویا گردِ بادِ واپسیں
یا فروغِ تابناک و بے حدود و بے ثغور
جانتا ہوں میں کہ یہ شیری ہے، روباہی نہیں
کس طرح ہاتھ آئے گی خونِ محمدؐ کی تپش
اے ضمیرِ کائنات! اے محرمِ دنیا و دیں!
کیوں رگوں میں وہ نشاطِ اندروں باقی نہیں
مے کدہ ہے مے نہیں! مے خوار ہیں ساقی نہیں!

جواب

اے کہ تیری "مے" "ابھی تک ہے حریمِ تاک" میں
کس جہاں کا عکس ہے آئینۂ افلاک میں
کیا خبر تجھ کو زمین و آسماں کا فرق ہے
طائرِ بام اور شاہینِ سرِ افلاک میں

حکمرانی ہے جہاں میں صاحبِ تدبیر کی
تو اُلجھ کر رہ گیا تقدیر کے پیچاک میں

دم زدن میں کانپ اُٹھے عرش و کرسی کا نظام
ہے وہ قوت مردِ مومن کی نگاہِ پاک میں

اے خرابِ بے خودی! نا واقفِ عزم و عمل!
زندگی بیدار ہوتی ہے دلِ بیباک میں

جس کی ضو سے جگمگاتا ہے محیطِ بیکراں
وہ گہر ملتا نہیں گنجینۂ ادراک میں

ساقیٔ افرنگ نے تجھ سے چھپائی ہے یہ بات
عالمِ نَو ہے خودی کے آبِ آتشناک میں

بندۂ صاحب نظر سے پوچھ اسرارِ حیات
رازِ فطرت آ نہیں سکتا ترے ادراک میں

جب بھڑک اُٹھتا ہے سینے میں شرارِ آرزو
ٹوٹ جاتا ہے طلسمِ چار سوئے رنگ و بو!

اے ہستیٔ بیتاب

کب خواب سے اٹھیں گے یہ مردانِ گراں خواب
مدت ہوئی، ہے سازِ خودی تشنۂ مضراب
اے ہستیٔ بیتاب

صوفی کی نظر نوحہ گرِ عظمتِ رفتہ
مُلاّ کا جنوں نالہ کشِ منبر و محراب
اے ہستیٔ بیتاب

افسوس کہ مومن کو گوارا ہوئی سیری
یہ دورہے مومن کے لیئے ساغرِ زہراب
اے ہستیٔ بیتاب

ہوں جس سے نہنگوں کے نشیمن تہہ و بالا
پنہاں ہے ابھی بطنِ صدف میں وہ دُرِ ناب
اے ہستیٔ بیتاب

بہ فیض ترے داغِ جگر کا ہے وگرنہ
ہر شب میں نہیں نور فشاں مشعلِ مہتاب

اے ہستیٔ بیتاب

وہ شعلہ جو تھا جلوہ گہِ طور پہ رقصاں
کرتا نہیں میری نگہہِ شوق کو سیراب

اے ہستیٔ بیتاب

کیا معرضِ گفتار میں آئیں مرے احوال
نے سطوتِ اسکندر و نے عظمتِ سہراب

اے ہستیٔ بیتاب

ہنگامۂ الفاظ پہ قابو نہیں رہتا
پوشیدہ ہیں بے ربطیٔ افکار کے اسباب

اے ہستیٔ بیتاب

واقف نہیں میں رازِ تب و تابِ جنوں سے
کر میری طبیعت کو عطا جوہرِ سیماب

اے ہستیٔ بیتاب

اسرارِ حیات

یہ جہانِ کاف و نوں، یہ محفلِ ذات و صفات
اس میں کیوں ممکن نہیں مردِ مسلماں کی نجات
لے خدائے کائنات

آہ یہ لادینئ افکار کا صیدِ زبوں
جس نے لوٹا تھا کبھی سرمایۂ لات و منات
اے خدائے کائنات

عقدۂ مغرب سے ہے ماؤف ذہنِ جبرئیل
مردِ مومن میں نہیں اب وہ ملوکانہ صفات
اے خدائے کائنات

ڈھونڈتا ہے یہ سرابستاں میں آبِ زندگی
ساغرِ زہراب ہے اس کے لئے جامِ نبات
اے خدائے کائنات

ہے رہینِ بے خودی، نا واقفِ خود آگہی
جس کی تکبیروں سے بے پردہ جمالِ عینِ ذات

اے خدائے کائنات

آ گئی آخر فریبِ صبحِ ہست و بود میں
بندۂ حق بین و حق اندیش کی تاریک رات

اے خدائے کائنات

اس کے ذہن و دل پہ قابض ہے وہ ابلیسی نظام
جو چھپا دے اِس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

اے خدائے کائنات

میری ہستی عشرتِ امروز کی تفسیر تھی
کاش مجھ کو کاہشِ فردا سے مل جاتی نجات

اے خدائے کائنات

کیا ہے اک اشکِ مسلسل کے سوا میری بساط
میں فقیرِ رہ نشیں تو بادشاہِ شش جہات

اے خدائے کائنات

صدائے غیب

تھک کے رُک جاتا ہے جس دم کاروانِ رنگ و بو
چوس لیتی ہے خزاں معصوم کلیوں کا لہو

التہاب افروز ہوتی ہے شعاعِ مہرِ عشق
جب نظر آتا ہے خالی مردِ مومن کا کدو

رزمِ خیر و شر میں ہے سوزِ درونِ کائنات
قطرۂ شبنم سے ہیں سورج کی کرنیں سرخ رو

کیا ہوئی اے بندۂ مومن وہ شاہینی امنگ
ہے ازل سے تیرا مشرب احتساب چار سُو

دستِ قدرت روئے منزل سے اُٹھاتا ہی نقاب
جلنے لگتے ہیں دلوں میں جب چراغِ آرزو

غیرتِ فردوس ہو سکتا ہے جوشِ عزم سے
یہ دیارِ موت پرور، یہ جہانِ شعلہ خو

تیری بربادی پہ روحِ عصر کرتی ہے فغاں
اے پریشاں روزگار! آشفتہ دل! آشفتہ ہُو!
چھا رہا ہے وسعتِ ماحول پر ذوقِ نمود
ورنہ ہے کنجِ صدف ہی سے گہر کی آبرو
ہے خدا کو آج تیرا امتحاں مدِّ نظر
دیکھ یہ قرآن اور خنجر ہے، وہ ساز و سبو!!

ایک دوست سے

ابر و باد کے فتنے، خاک و خوں کے ہنگامے
یہ خرد کی بیتابی، یہ جنوں کے ہنگامے
حد سے بڑھتی جاتی ہے غم کی حشر سامانی
پھر خزاں رسیدوں پر ہنس رہی ہے ویرانی
اب گمانِ دوزخ ہے بوستانِ امکاں پر
چھا گئی ہے خاموشی سلسبیل و فاراں پر
کتنے قہقہے گم ہیں رُوح سوز آہوں میں
کتنے خارزار آئے آدمی کی راہوں میں
اب کہاں وہ ضَوباری عِصمت و صداقت کی
ٹمٹمائی جاتی ہے شمع آدمیت کی

اس جہانِ فانی میں کس قدر رسول آئے
روئے کس قدر بادل، کتنے پھول کمھلائے
صرصرِ حوادث نے گل کھلائے ہیں کیا کیا
خالقِ دو عالم کے گیت گائے ہیں کیا کیا
خاک پر لہو چھڑکا کس قدر گھٹاؤں نے
پھینک دی ہیں پتواریں خود ہی ناخداؤں نے
آہ کتنے گل خانے رنگ و بو سے ہیں عاری
کس قدر اُجالوں پر تیرگی رہی طاری
بجلیوں کے ڈیرے ہیں کتنے آشیانوں میں
بے بسی جھلکتی ہے کس قدر ترانوں میں
کتنے راہ گیروں نے جان دی سرابوں پر
ظلمتیں ہیں مستولی کتنے ماہتابوں پر
یاس کے تھپیڑوں سے دل کی آگ کجلائی
بارہا دھندلکوں نے موت کی قسم کھائی

عرش و فرش کانپ اُٹھے، تھرتھرائے سیّارے
کھو گئے اندھیروں میں کس قدر سحر پارے
اک طرف چٹانیں ہیں، اک طرف سفینے ہیں
برق و سیل کی زد میں کتنے آبگینے ہیں
ہیں وطن پرستوں میں دشمنِ وطن کتنے
فصلِ گل کے سائے میں جل گئے چمن کتنے
خلوتِ حقیقت پر اب بھی ہیں وہی پردے
کاش رازِ ہستی سے کوئی آشنا کردے
کیا خبر تجھے ظالم! کتنے غم کے مارے ہیں
زندگی کی پلکوں پر کس قدر ستارے ہیں!

سرودِ فطرت

یہ دامنِ دشت، یہ شبِ ماہ
ہر سمت کھلے ہوئے سمن زار

تا حدِ نگاہ سیمِ سیال
تاروں کے چراغ ہیں فسوں کار

یہ سرد ہوا کی دل فروزی
ہر موج میں نزہتوں کے انبار

خاموش فضائیں، زرد رو چاند
ظلمت سے نجوم گرمِ پیکار

شبنم ہے کہ حوریانِ جنت
ہیں عرصۂ خاک پر گہر بار

یہ جوئے رواں کی گل فشانی!
کہتی ہے سمندروں کے اسرار

ہستی کے محیطِ جاوداں سے
پھوٹا ہے خودی کا سیلِ انوار

احساس کے پھول چن رہا ہوں
آوازِ سروش سن رہا ہوں

جس کی تگ و دو مجاہدانہ　　لرزاں اُس سے دلِ زمانہ!

شہباز کی طرح پر کشا ہو　　کب تک یہ جمودِ آشیانہ!

کھل جائیں ابھی قفس کے تالے　　صرف ایک نگاہِ باغبانہ!

مطرب ہے نہ مغبچے نہ ساغر　　عنقا ہوئی اب مئے شبانہ!

تلچھٹ سے بجھی ہے پیاس کس کی؟　　اے گدیہ گرِ شراب خانہ!

افسانۂ دردِ زیست کب تک!　　تا چند شکایتِ زمانہ!

کانٹوں میں ہیں زندگی کے شعلے!　　ذروں میں حیات کا خزانہ!

اب نام کے رہ گئے ہیں غازی　　باقی نہیں ضربِ غازیانہ!

تاگے گُل وُمل کی نرم باتیں　　چھیڑ آہن و سنگ کا فسانہ!

خاموش ہیں تارِ عودِ فطرت

بیدار ہو اے سرودِ فطرت!

بہشتِ بریں

یہ علم و فن کے دُھندلکے، یہ عطرِ دمے کے سراب
یہ شبستانِ الم، یہ سوادِ اہلِ کتاب
یہ تیغِ ناز، یہ ہنگامۂ فراق و وصال
یہ زندگی کی تمنّا، یہ زندگی کا مآل
شبِ سیاہ کے پرچم ہیں لہلہائے ہوئے
نگارِ عصمت و عرفاں کی لاش اُٹھائے ہوئے
یہ امتحانِ وفا، یہ حریمِ دار و رسن
بھڑک رہے ہیں بیاباں، سلگ رہے ہیں چمن
یہ نازِ رنگ و نسب، یہ غرورِ دولت و دیں
اُلٹ رہا ہے زمانے کا صفحۂ خونیں

لہو پیا ہے سیاست کے انقلابوں نے
انڈیل دی ہے سیاہی خود آفتابوں نے
ہر ایک لحظہ دگرگوں ہے بزمِ شمس و قمر
چمک رہے ہیں ستارے کہ رو رہی ہے سحر
تڑپ رہی ہے فنا کے ستم کدے میں حیات
فریبِ خوش نظری ہے طلسمِ ذات و صفات
ابھی ہجوم ہے افلاس و غم کے ماروں کا
سہاگ لوٹ نہ لے رات ماہپاروں کا
اُبل رہے ہیں ابھی تک لہو کے فوّارے
زمیں سے ہار گئے کس قدر فلک پارے
حقیقتوں کو ابھی سوگوار رہنا ہے
کہ میر و شاہ نے کانٹوں کا تاج پہنا ہے
نہ پوچھ کھو گئے آہوں میں قہقہے کتنے
بشر کے روپ میں پھرتے ہیں اژدہے کتنے

وطن فروش کوئی، اور کوئی ضمیر شکار
یہ صادقوں کا تجمل، یہ جعفروں کا وقار
ہر ایک موج الجھتی رہی سفینوں سے
دلوں کی آگ جھلکتی رہی جبینوں سے
چراغِ صبح اندھیرے پہ خندہ زن کیا ہو
یہی ہے خلوتِ ہستی تو انجمن کیا ہو
نشاطِ روح دنوں میں ہے اب نہ راتوں میں
عنانِ کعبہ و کاشی ہے کس کے ہاتھوں میں
تری "بہشت بریں" مرگ آفریں تو نہیں
میں سوچتا ہوں یہ لاشوں کی سرزمیں تو نہیں!

خزاں کے پھول

یہ تنگنائے قفس، یہ سیاستِ صیاد
یہ آب و گِل کے تلاطم، یہ وسعتِ برباد
یہ تیرگی، یہ دلِ مہر و ماہ کی دھڑکن
یہ آنسوؤں کے ستارے، یہ عصمتوں کے کفن
یہ بھیگتی ہوئی پلکیں، یہ ٹوٹتے ہوئے دل
یہ ریگ زارِ حقیقت، یہ پردۂ محمل
یہ چیختی ہوئی روحیں، یہ حسرتوں کے صنم
یہ بزمِ کفر و یقیں، یہ جہانِ دیر و حرم
یہ شورِ حشر، یہ پیکارِ سبحہ و زنّار
یہ جاں گداز فضائیں، یہ روح سوز بہار

یہ آندھیوں کی قطاریں، یہ کاروانِ حیات
نہ پوچھ کتنے شگوفے ہیں مرکزِ آفات
سوادِ زیست میں طوفان آئے ہیں کیا کیا
چراغِ صدق و صفا جھلملائے ہیں کیا کیا
ایاغ چھوٹ پڑے مے کشوں کے ہاتھوں سے
عیاں دلوں کی سیاہی ہے کتنے ماتھوں سے
نگل چکی شبِ غم کن سحر شکاروں کو
کہ زلزلوں نے جگایا ہے فتنہ زاروں کو
حیات مرگِ محبت پہ نوحہ خواں ہے ابھی
وہی فسانۂ افلاس جاں ستاں ہے ابھی
اُداس اُداس ہی راتیں تھکے تھکے سے نجوم
یہ ابر و باد کی یورش، یہ بجلیوں کا ہجوم
یہ تیرہ بزمِ جہاں، یہ شکستِ قلب و نظر
محل بنائے ہیں قارونیوں نے لاشوں پر

دلوں پہ یاس کے ہوتے رہے ستم کیا کیا
کراہتے رہے زلفوں کے پیچ و خم کیا کیا

دیارِ شوق میں گونجے ہیں مرثیے کتنے
بجھا گئی ہے نسیمِ سحر دیے کتنے

وہی صداقت و احساس کے جنازے ہیں
عذارِ گنگ و جمن پر لہو کے غازے ہیں

وہی خدا ہیں، وہی بت، وہی رسول ابھی
سمنستاں میں ہیں باقی خزاں کے پھول ابھی

چمن ہزار سمومِ خزاں سے کھیلے ہیں
مگر ہنوز وہی بے بسی کے میلے ہیں!

ظلمتِ رخشاں

یہ بھڑکتی سیج، یہ جلتے کفن
نغمہ و نزہت کی شمعیں بجھ گئیں
ہے ابھی تک سوزِ فطرت خواب میں
آگ کے دریا بہاتی ہے حیات
لُوٹ لو دربار و ایواں کا شباب
رُخِ گیتی پہ رہیں جب تک یہ داغ
یہ تڑپتے گیت، زخمی عصمتیں
صبحِ منزل بن گئی ہے گردِ راہ
پھونکنے دو خرمنِ دل یاس کو
یہ شبِ غم! یہ بھٹکتے کارواں!
مسکراتے ساز و ساغر توڑ دو
سُرخ شعلوں کا تبسم سرمدی

کس قدر غنچے ہیں مجبورِ سخن
خونچکاں انسانیت کی آستیں
کشتیوں کو جھونک دو گرداب میں
خون سے قہقہ لگاتی ہے حیات
آ رہا ہے شعلہ پیکر انقلاب
مل نہیں سکتا اُجالے کا سُراغ
یہ سحر، یہ چلتی پھرتی تربتیں
الاماں یہ ظلمتِ قصر و کلاہ
کند کر دو نشترِ احساس کو
یہ محبت کا سرودِ رائگاں!
تند لہروں پر سفینہ چھوڑ دو
سنگ و آہن کا ترنم سرمدی

غیر فانی سیل و صرصر کا سہاگ
جاگ اے تخریب کے پُرہول ناگ!

اخلاص و ایماں

یہ اندھیری رات، یہ صبحِ پریشاں کے قریب
الحفیظ والاماں اخلاص و ایماں کے قریب

صرف اپنی خود پرستی کو چھپانے کے لئے
تم نے کیا کیا بت بنائے ہیں زمانے کے لئے

کاش آہوں کو عطا ہو جائے وہ حسنِ قبول
تھرتھرائے خود مشیت، کانپ اٹھیں جھوٹے رسول

اُف یہ رُوئے زندگی پر آنسوؤں کی چلمنیں
قلبِ موجوداتِ میں بل کھائیں اندھی ناگنیں

یہ بھڑکتی ظلمتیں، یہ چیختی شمعِ ضمیر
چھوٹ جائیں کاش تہذیب قیادت کے اسیر

شبستاں بے نور ہوں؟ مُرجائیں نسرین و گلاب
سرنگوں ہو رعب ہستی سے ہمالہ کا شباب؟
کیا قیامت ہے کہ یہ ابلیس کی نسل ذلیل
چھین لینا چاہتی ہے عظمتِ فاران و نیل
یہ امارت کے خدا، یہ مفلسی کے اژدہے
آدمی کا خون پی کر مارتے ہیں قہقہے
بے محابا مسکراؤ، خون چہرے پر ملو
اے مچلتے زلزلو! اے دندناتے بادلو!
وحشت و افلاس کی اک آگ لہراتی رہے
چار سو ویرانیوں کے راگ برساتی رہے
باطنِ آفاق میں ظلمات کے پرچم گڑیں!
یہ چمکتے، جگمگاتے چاند سورج گر پڑیں!
لوٹ لو یہ قصر و ایوان کی بہارِ زر فشاں!
پر فشاں ہو جاؤ اے جاں ہو اے ابر فشاں!

قالبِ صرصر میں ڈھل جائے نسیمِ صبحدم

ثبت کردے ایک اک ذرّے پہ عنوانِ عدم

اے سیاہی کروٹیں لے! اے شبِ تاریک جاگ

بس اُگل ہاں بس اُگل اے دولتِ عصیاں کے ناگ

آندھیو! پھر کارواں در کارواں آنے لگو

اے غنودہ بجلیو! پھر ناچنے گانے لگو

نام کو باقی نہ رہ جائے اُجالا دہر میں

اے دھندلکو! اپنے تیروں کو بجھاؤ زہر میں

روز افزوں ہو چلیں گمراہیاں انسان کی

بزمِ ہستی کو ضرورت ہے کسی طوفان کی!

شکست

قلبِ ہستی میں ویرانیاں بس گئیں
ماہپاروں کو تاریکیاں ڈس گئیں

ذرہ ذرہ وطن کا ہے خونیں کفن
قبر کی رات ہے یا صباحِ وطن
شعلہ خو ہے زمیں، چرخ ہے شعلہ زن
جاگ کر سو گئی روحِ گنگ و جمن

ہے محیطِ جہاں ایک ظلمت نئی
وہ محبّت کی صبحِ نگاریں گئی

کس قدر راہ رو راہ میں کھو گئے
پھول کمھلائے، فانوس گُل ہو گئے
اہلِ دل موت کی گود میں سو گئے

خود پرستی کی اس بزمِ ناپاک میں
زیست اُلجھی رہی "فرض و ادراک" میں

ڈھونڈتی ہے تمنّائے نوعِ بشر
دین و دولت کی افسوں گری سے مفر
نور کی جستجو۔ آرزوئے سحر
عافیت کی دعا مانگتی ہے مگر
بند ہے آہ صد یوں سے بابِ اثر

رنگ و نزہت کے مغرور شاہنشہو!
تم یہ فصلِ خزاں عکس آرا نہو،،

کاش نابود ہو جائیں دیر و حرم
یہ بتوں کی جفا، یہ خدا کے ستم
اُف یہ پُر سوز جذبات کا زیر و بم
مٹ گئی زندگی زندگی کی قسم

کارواں گردِ منزل میں کھو جائے گا
آسماں اور بھی آگ برسائے گا
کہکشاں کا علَم اب نہ لہرائے گا

شکوہ

ترے جہاں میں وہ انساں بھی پائے جاتے ہیں

حقیقتوں پہ بھی جن کو گمانِ خواب رہا
جو فصلِ گل کو سمجھتے رہے سرابِ نظر
خرابِ یورشِ صرصر مدام جن کے چمن
ازل سے جن کے نشیمن میں رقصِ برق و شرر
وہ جن کے پیرہنوں میں بوجہِ بے نوری
کبھی ہوا نہ فروزاں چراغِ قلب و نظر
جبین پہ وہم کے بادل، خیال آوارہ
نہ دل میں نورِ تمنا نہ خال و خط میں سحر
ہنوز اک اشکِ مسلسل ہے زندگی جن کی
ہنوز جن کی دعاؤں کو ہے تلاشِ اثر

نہیں ہے تابشِ ادراک جن کی دنیا میں
جو ظلمتوں میں لٹاتے رہے متاعِ نظر
وہ تیرہ بخت کہ جن کے غریب خانوں تک
پہونچ سکی نہ کبھی روشنیٔ مہر و قمر
جو غفلتوں کے پجاری ہیں، بے حسی کے غلام
جو ڈھونڈتے ہیں تہی سیپیوں میں جوشِ گہر
اِنھی پہ صرف ہوئی تیری قوتِ تخلیق!
اِنھی پہ ختم ہے تیرا کمالِ علم و ہنر!
ہر ایک چیز کو ہے انتظارِ آدمِ نو
نجوم چشم براہ و غمین نگارِ سحر
یہ صبح و شامِ چمن! یہ بہارِ توبہ شکن!
حسین ہے تری فرسودہ کائنات۔ اگر
یہاں اُداس بیاباں بھی پائے جاتے ہیں!!

جرأتِ گفتار

کس قدر گلستاں ہیں رنگ و نور کے مدفن

میرِ کارواں کتنے بن گئے ہیں خود رہزن

کھا لیا اندھیرے نے کتنے برق پاروں کو

ٹوٹنا پڑا آخر بربطوں کے تاروں کو

سَم فشاں حوادث کے کتنے قافلے آئے

کتنی کشتیاں ڈوبیں، کتنے چاند گہنائے

بارہا گلابوں کی جان لی ببولوں نے

آدمی کو بہکایا کس قدر رسولوں نے

محوِ خواب ہیں طوفاں آج بھی سفینوں میں

داغ ہیں جبینوں پر، بُت ہیں آستینوں میں

گو کہ فیضِ موسم سے ہر روش مہکتی ہے
آج بھی شگوفوں میں آگ سی دہکتی ہے
یہ بجھی بجھی سی شمعیں، یہ اُداس ویرانے
ہو گئے تہی آخر زندگی کے پیمانے
زنگِ یاس و محکومی کھا گیا دماغوں کو
پوجتے رہے لالے اپنے دل کے داغوں کو
ہر نفس میں چنگاری، ہر نظر میں ویرانی
اک سرابِ رنگیں ہے یہ عروجِ انسانی
ہو گئی ہیں چہروں پر نقش حسرتیں کیا کیا
ایک ایک ذرے میں ہیں قیامتیں کیا کیا
پھر نشاط گاہوں پر مسکرائے غم خانے
مسجدیں شرار آگیں شعلہ گوں صنم خانے
دہر پر تسلط ہے اک مہیب ظلمت کا
عکس بھی نہیں باقی جلوۂ حقیقت کا

یہ فنا زدہ دنیا قبر ہے محبّت کی
ہر قدم پہ ملتی ہے لاش آدمیّت کی
موت آ کے چھا جائے نو شگفتہ پھولوں پر!
حیف ہے مشیّت کے رُوح سوز اصولوں پر
اس کے کھلونوں سے تو نے مجھ کو بہلایا
گاہ آگ برسائی، گاہ خون برسایا
میرے آشیانے پر بجلیوں کی بارش کی
ہاں مجھے مٹانے کو زلزلوں سے سازش کی
کھل گیا زمانے پر سحرِ جاوداں تیرا
اب زمین تیری ہے اور نہ آسماں تیرا!

خزاں کی آواز

وہ جاگ اُٹھی عروسِ فطرت، وہ رُخ سے زلفیں ہٹا رہی ہے
فضا میں اک شور سا بپا ہے، نسیم فردوس آ رہی ہے
ہر اک شگوفہ مہک رہا ہے، کلی کلی مسکرا رہی ہے
وہ تیتری رقص کر رہی ہے، وہ یاسمن گنگنا رہی ہے
حیات جلوے دکھا رہی ہے، بہار موتی لُٹا رہی ہے
چمن چمن ہے نگار خانہ، روش روش جگمگا رہی ہے
طرب کی مغرور شاہزادی طرب کا پرچم اُڑا رہی ہے
جنوں کے شعلے بھڑک رہے ہیں خرد کی لَو تھرتھرا رہی ہے
نگارِ تخلیق گا رہی ہے بہار کے سازِ گل فشاں پر
بہار کے سازِ گل فشاں پر نگارِ تخلیق گا رہی ہے
حیات افروز و دل نشیں ہے شعاعِ مہتاب کا تبسم
شعاعِ مہتاب کے تبسم میں زندگی جھلملا رہی ہے

اُٹھو کہ غنچے نکھر چکے ہیں، نئے مناظر اُبھر چکے ہیں
سنو کہ گلبرگِ تر سے شبنم نئے ترانے سُنا رہی ہے
زمیں سے چشمے اُبل رہے ہیں، ہوا سے پودے مچل رہے ہیں
وہ فاختہ غسل کر رہی ہے، وہ ننھی چڑیا نہا رہی ہے
یہ شمعِ نسریں، یہ شامِ سنبل، یہ بادۂ لعل و ساغرِ گل
نہ پوچھیے سرخوشی کا عالم نگاہ تک لڑکھڑا رہی ہے
کششِ جاوداں سے بہتر ربودگی کا یہ ایک لمحہ
سرک رہا ہے نقابِ ہستی کہ رات جادو جگا رہی ہے
بہار ہیں کون روک سکتا ہے مجھ کو اے دوست مے کشی سے
بہار ہیں مے کشی روا ہے! روا رہے گی! روا رہی ہے
شباب کی وادیوں میں ناداں! شراب سے احتراز کیوں ہو
شراب تو روزِ اولیں سے شباب کی رہنما رہی ہے
مگر..... یہ کیا ہے کہ فصلِ گل میں ہموم کا گیت سن رہا ہوں
مجھے حجاباتِ ابر و گل سے خزاں کی آواز آ رہی ہے!!

بے بسی

یہ بھٹکتی ہوئی روحیں، یہ نشیب اور فراز
تیری محفل میں فروزاں نہ ہوئی شمعِ نیاز
تجھ کو تکلیفِ سماعت رہی میری آواز
آنسوؤں سے نہ ہوئی سرد تری آتشِ ناز
نہرو اُلفت کے ترانے رہے خوابیدۂ ناز

عشق بے چارہ سمجھتا ہے جسے صبحِ چمن
پیکرِ صبح میں اک رات ہے ویرانے کی

گردشِ رنگ سے تزئینِ نظر کیا ہوتی
ہاں مری راہ تری راہگزر کیا ہوتی
تجھ کو بیمارِ محبت کی خبر کیا ہوتی
ہجر کی رات ہم آغوشِ سحر کیا ہوتی

جس کو میں سوزِ حقیقت کا نشاں کہتا تھا
نہر تھی وہ کسی تاریک نہاں خانے کی

آج تک مل نہ سکی بارِ تمنا سے نجات
آج تک تشنۂ تعبیر رہا خوابِ حیات

رُوحِ محتشم

نذیرِ شہید

وہ لُو کے جھونکوں سے ڈگمگائی اداس پہنائی کربلا کی
نظر یہ محسوس کر رہی تھی کہ شعلہ زن ہے بساطِ خاکی
جہاں بگولوں کا رقص پیہم فضا میں اک حشر اُٹھا رہا تھا
سمومِ آتش نفس کا خونخوار دیوتا گنگنا رہا تھا
برس رہی تھیں زمیں کے سینے پہ سرخ تپتی ہوئی شعاعیں
وہ تیز، جلتی ہوئی، جھلستی ہوئی، تڑپتی ہوئی شعاعیں
عروسِ ارضی تھی آبدیدہ زمیں کی چھاتی دہل رہی تھی
تپِ بلا خیز معصیت سے تمام دنیا پگھل رہی تھی
حسینؑ، وہ صف شکن مجاہد جہل سے آنکھیں لڑانے والا
رضا کی پُرخار وادیوں میں وفا کی شمعیں جلانے والا

کاش ہوتا نہ مرے ذوقِ فراواں میں ثبات
یہ مصائب کا جلوس اور یہ آفات کی رات

یہ عقیدوں کا تلاطم، یہ اندھیرے کا خروش
ہیں نہیں لاش ہے گویا کسی پروانے کی

ایک اک جنبشِ لب آہ و فغاں کا پیغام
یہ سرابوں کے بچاری، یہ غلاموں کے غلام
مجلسِ جور و جفا، کارگہہ دانہ و دام
ہائے یہ تیری خدائی کا جہاں سوز نظام

ہیں یہاں کتنے اُجالوں پہ دُھندلکوں کے غلاف
دہر ہے یا کوئی تصویر سیہ خانے کی

اب نہیں باعثِ تسکیں تری آیاتِ جمیل
سالہا سال سے انسان کی فطرت ہے علیل
ٹمٹماتی ہی رہے گی مرے دل کی قندیل
یہ سیاہی ہے کہ بڑھتی ہوئی ظلمت کی دلیل

ظلمتِ یاس ہے طاری، نہ کر اب سعئ فضول
میرے "آئینۂ کردار" کو چمکانے کی

نیام جس کا، تھا پارہ پارہ، لباس جس کا پھٹا ہوا تھا
ہزار ہا خود پرست و خود کام دشمنوں میں گھرا ہوا تھا

سلام اُس پر، جو غم کے ظلمت کدے سے ابھرا "حسینؑ" بن کر
ردائے فقر و قلندری میں امیرِ بدر و حنینؑ بن کر

حسینؑ جس نے فسردہ غنچوں کو اک نئی تازگی عطا کی
وہ خضر ہے منزلِ وفا کا، وہ روشنی ہے دلِ صفا کی

وہ مردِ آزاد، لحظہ لحظہ فزوں ہے زورِ شباب جس کا
حیات جس کی چراغِ حیدرؓ، دلِ پیمبرؐ خطاب جس کا

وہ جس کی لب تشنگی سے رودِ فرات پر مردنی ہے طاری
حسینؑ انسانیت کا ہیرو، یزید انسانیت سے عاری

چمن چمن میں، روش روش پر کیا چراغانِ طور جس نے
بنا دیا ایک سنگریزے کو غیرتِ کوہِ نور جس نے

دیا ہے بے جان آدمیت کو زندگی کا پیام جس نے
سلام اُس پر، کیا ہے ثابت خدا کی رحمت کو عام جس نے

حسینؑ جس نے رُخِ قضا و قدر سے پردہ اُٹھا دیا ہے

جو اپنے لختِ جگر کو مقتول دیکھ کر مسکرا دیا ہے

وہ جس کے فیضِ قدم سے اب تک تمام ذرّے چمک رہے ہیں

حقیرِ خاک اس قدر منوّر! انجوم حیرت سے تک رہے ہیں

وہ جس کے رعبِ خود آگہی سے لرز رہا ہے دلِ زمانہ

وہ جس کے ہر ایک نقشِ پا میں رموز و اسرار کا خزانہ

وہ جس کے نیزے کو چوم کر مسکرائی چشمِ نگارِ ہستی

بنا دیا جس نے کربلا کو بیک نفس لالہ زارِ ہستی

سلام اُس پر جو حق نما ہے، جو راکبِ دوشِ مصطفےٰ ہے

وہ جس نے صبر و رضا کے صبر آزما مراحل کو طے کیا ہے

جہاں کو رخشندگی عطا کی ہے اپنے انوارِ چار سو سے

کیا ہے اک انقلاب پیدا ترا وشِ خونِ مشکبو سے

وہ جس نے اپنے لہو سے کی گلستانِ ملّت کی آبیاری

لیا ہے برقِ تپاں نے جس کے جلال سے درسِ شعلہ کاری

وہ جس کے آگے حیاتِ جاوید ہاتھ باندھے ہوئے کھڑی ہے

وہ جس نے صرف اک نگاہ کی ہے تو خاک اکسیر ہو گئی ہے

ہے منتظر جس کی واپسی کا ہر ایک ذرہ، ہر ایک تارا

ہنوز وہ روحِ محتشم ہے ضمیرِ فطرت میں حجلہ آرا

جو عشق و مستی، سکون و آسودگی کے جوہر لئے ہوئے ہے

وہ جس کے دل میں خدا ہے، سر پر رسولؐ سایہ کئے ہوئے ہے

وہ جس کی اک ضربِ لاالٰہ نے حضیضِ باطل کو روند ڈالا

مجھے یقین ہے پھر آئے گا وہ دلوں کو بیدار کرنے والا!

صحرا

کہاں تک نغمہ خوانیِ سازِ غم پر اے دلِ وحشی

جنوں کی ناپذیرائی پہ رو سکتی نہیں فطرت
مرے احساس کی قندیل ہو سکتی نہیں فطرت

خزاں کی رات کیا ہو گی منوّر اے دلِ وحشی

حیاتِ عشق کی افسردہ سامانی نہیں جاتی
یقین و کفر کی آتش بدامانی نہیں جاتی

وہی ہے شورشِ زنّار و منبر اے دلِ وحشی

امیرِ کارواں کے بھیس میں خونی لٹیرے ہیں
نہ پوچھ احرام میں لپٹے ہوئے کتنے سپیرے ہیں

صنم خانوں میں ہیں کتنے فسوں گر اے دلِ وحشی

نگاہوں میں ابھی جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
ابھی انساں بتانِ دین و دولت کا پجاری ہے

ابھی انسانیت ہے خاک بر سر اے دلِ وحشی

خود آگاہی کے مدفن، ظلمتِ عصیاں کے گہوارے
فقط خوابوں کے ویرانے ہیں یہ خوش رنگ سیارے
اُجالا ہے فریبِ ماہ و اختر اے دلِ وحشی

بگولے رقص فرما ہو گئے آئینہ خانوں میں
ہوا سے لگ گئی ہے آگ کتنے آشیانوں میں
صبا سے جل گئے کتنے گلِ تر اے دلِ وحشی

یہ تاریکی، یہ وحشت، یہ لبِ ہستی پہ سرد آہیں
یہ کالے ناگ کی مانند لہراتی ہوئی راہیں
نظر آتا نہیں ہے کوئی رہبر اے دلِ وحشی

یہ صحرا، جیسے خاکہ ہو کسی ویران جنّت کا
نہیں ہے کوئی عرفانی سسکتی آدمیت کا
کہ اب بھی چمچماُ اٹھتے ہیں خنجر اے دلِ وحشی
کہاں تک نغمہ خوانی سازِ غم پر اے دلِ وحشی!

عقل و عشق

خواہ اسکندر و جم ہوں کہ گدایانِ ذلیل
جامۂ عقل سے فطرت نہیں ہوتی تبدیل
نے کوئی راہ نما، نے کہیں آوازِ دلیل
عشق با ایں ہمہ وارفتہ و سرگرمِ رحیل
مستیٔ بادۂ کردار سے محروم ہے عقل
عشق کا نشۂ گفتار سراغِ جبریل
عالمِ عشق میں تخریب کے آثار کہاں
عقل کا ہاتھ ہے تاراجیٔ گلشن میں دخیل
عشق کی شان سے لرزاں ہے خدائی اے دوست
عقل بھولی نہیں وہ منظرِ خوابیدۂ نیل

عقل کی نادرہ کاری نے بہت رُخ بدلے
سرد ہوتی ہی نہیں آتشِ گلزارِ خلیل

عقل اک خوابِ پریشاں کے سوا کچھ بھی نہیں
پردۂ عشق میں پنہاں ہے اچھوتی تمثیل

عشق انساں کو سکھاتا ہے قوانینِ حیات
عقل بے چارگیٔ شوق کی اک زندہ دلیل

اُٹھ کہ ہر ذرّے سے ملتا ہے پیامِ برخیز
کیا سُنائی نہیں دیتی تجھے آوازِ رحیل!

یہ انسان — یہ کائنات

اک جہاں ایسا بھی ہے اس وادیٔ خونیں سے دور
دور چرخِ نیلگوں سے، زہرہ و پرویں سے دور
جس جہاں میں عشق و مستی ہیں مسلسل نغمہ بار
جس جہاں کے ذرّے ذرّے میں نہاں رُوحِ بہار
جس حریمِ کیف میں، جس دلبری کے اوج پر
دیکھ سکتی ہے فرشتوں کے تبسم کو نظر
جس جگہ دن کو بھی جلتے ہیں ستاروں کے چراغ
ہیں زلالِ صبح سے لبریز کلیوں کے ایاغ
جس گلستاں پر نہیں دیوِ خزاں کی دست رس
جس جگہ ناپید ہیں صیاد، عنقا ہیں قفس

جس جگہ انسان سچ کہنے سے گھبراتا نہیں

جس چمن میں پھول کِھلتا ہے تو مرجھاتا نہیں

آدمی "کردار" کے سانچے میں ڈھلتا ہے جہاں

خاک سے بھی چشمۂ زمزم اُبلتا ہے جہاں

وہ جہانِ رنگ و بو خلدِ بریں جس سے خجل

یہ جہانِ گندم و جو اک سرابِ مستقل

وہ جہاں بادِ سحر گاہی ہے یہ بادِ سموم

بجلیوں کا آشیانہ، زلزلوں کی زاد بوم

ہے تڑپتی آندھیوں کی زد میں اب شمع حیات

ٹوٹ جائے گا کسی دن یہ طلسمِ شش جہات

آہ یہ تیرا جہاں، یہ جرم و عصیاں کی زمیں

"واہمے" کا آسماں، خوابِ پریشاں کی زمیں

جھونپڑے میں جاں بلب ہے، بھوک سے دہقانِ پیر

محوِ عشرت قصرِ بلّوریں میں سلطان و امیر

بندۂ مزدور ہے افلاس و نکبت کا شکار

ہیں ترے لطف و کرم کے مستحق سرمایہ دار

تیرے نائب مفلسوں پر حشر ڈھاتے ہی رہے

فاقہ کش کے آنسوؤں پر مسکراتے ہی رہے

میرے مولا! کیا یہی آدم ہے تیرا شاہکار!

یہ دلِ فطرت میں کانٹا! سینۂ گیتی پہ بار!

کیا اسی پر تو نے رکھی ہے اساسِ بحر و بر

کیا یہی ہے مادرِ ایّام کا لختِ جگر!

بے نوا شبنم پہ سورج روز برساتا ہے تیر

کیا یہی تیری خدائی ہے خداوندِ قدیر!

پہلی کرن

یہ کون وحدتِ آدم کا راگ چھیڑ گیا
کہ جگمگانے لگی کائناتِ خاک بسر
یہ کس نے آدمیّت کو لہو سے سینچا ہے
یہ کس کے خون سے قشقہ لگا رہی ہے سحر!
بجھی بجھی سی ہیں فکر و خلوص کی شمعیں
لُٹے لُٹے سے ہیں قلب و نظر کے گلخانے
کسے خبر کہ زمانہ سُنائے گا کب تک
یقین و کفر کے ادراک سوز افسانے

یہ دخترانِ مشیت کی چشمکِ پیہم
یہ آنسوؤں کے نشیمن، یہ جورِ لیل و نہار
نگاہِ شوق دھواں دے رہی ہے قرنوں سے
مٹے مٹے سے ہیں پھر زندگی کے نقش و نگار

یہ زرستاں یہ غلامی کی آندھیوں کا خروش
سسک رہے ہیں حریم خود آگہی کے کنول
چمن میں گونج رہے ہیں خزاں کے گیت ابھی
یہ حسرتوں کی گھٹائیں، یہ موت کے بادل

نہ پوچھ کتنے شگوفے ہیں زخمِ باغ و بہار
نہ پوچھ کتنے سفینے ہیں بارِ گنگ و جمن
خود اپنی "آگ" میں ہے روشنی نہائی ہوئی
خود آفتاب ہے نور و سرور کا مدفن

عذارِ مہر و قمر پر کہیں خراش نہ آئے
فلک جگا تو رہا ہے نئے اندھیروں کو
خرد کے ناگ کو پالا تو ہے سپیروں نے
کہیں یہ ناگ نہ ڈس جائے خود سپیروں کو

بجھا گئی ہے چراغوں کو خود ہوائے مراد
نسیمِ صبح نے چوسا ہے خون پھولوں کا

ہلاکِ خبثِ دیتیم خودی ہے تو، پھر بھی
مذاق تو نے اڑایا ہے کن رسولوں کا

یہ بے بسی کا اندھیرا، یہ سیم وزر کا خمار
رُخِ حیات کے پردے اُٹھا کے چھوڑوں گا
جہاں دلوں پہ ہے نفرت کی تیرگی طاری
وہاں چراغِ محبت جلا کے چھوڑوں گا!

تفسیرِ حیات

یاد ہے اخترؔ مجھے اب تک وہ تابستاں کی رات
یورشِ انوار میں گم تھا شبابِ کائنات
ذرّہ ذرّہ بادۂ انجام سے مدہوش تھا
تھی زمیں خاموش، پیر آسماں خاموش تھا
ساحرِ شب کا فسونِ خامشی تھا کارگر
سیپیوں کی گود میں خاموش تھے لعل و گہر
خندہ زن تھے ماہپاروں پر دلِ سوزاں کے داغ
تھے بہر سو ضَو فگن احساس و عرفاں کے چراغ
سیم گوں کرنوں سے یوں معمور تھا دامانِ کوہ
سیر کو گویا نکل آیا ہے پریوں کا گروہ
کہکشاں کا دامنِ زر بن گیا تھا گردِ راہ
دفعتاً اک منظرِ عبرت سے ٹکرائی نگاہ

جھلملا اُٹھی مری ضَو ریز قندیلِ خیال
مطلعِ قلب و نظر پر چھا گیا ابرِ ملال

دیکھتا کیا ہوں کہ رُوئے زندگی ہے پُر خراش
فرطِ غم سے قلبِ فطرت ہو گیا ہے پاش پاش

ہر طرف ظلمت فشاں ہے موت کا نقشِ قدم
ثبت ہے افسانۂ ہستی پہ عنوانِ عدم

دفن کرنے کے لئے رکھا ہے اک تربت کے پاس
اک مغنّی کا جنازہ سر بسر تصویرِ یاس

جن میں تھیں رقص و نوا کی تابشیں چھائی ہوئی
آہ اب وہ نرگسی آنکھیں ہیں پتھرائی ہوئی

آرزوئیں سرنگوں، مغموم اُمیدوں پہ زنگ
اُڑ گیا اک آن میں شاداب رخساروں کا رنگ

مضمحل چہروں پہ لہرائی ہوئی اک موجِ دود
آنسوؤں میں ڈوب کر نکھرا ہوا شورِ درود

ہے فنا کی وادیوں میں کاروانِ زندگی
ہو گیا خاموش آخر نغمہ خوانِ زندگی

اب کہاں ہے وہ ملائم نزہتوں کی انجمن
چار سو پھیلی ہوئی ہے بوئے کافور و کفن
آشیانہ ہے قضا کا یہ حریمِ رنگ و صوت
مستیوں میں اہرمن سے چشمکیں کرتی ہے موت
یہ محیطِ زندگی ہے بے ثبات و بے قرار
ہیں اجل کی چیرہ دستی سے کہتا ہے دل فگار
آہ اس طغیان میں کتنے سفینے کھو گئے
عصمت و ایمان کے مہر آسا نگینے کھو گئے
مٹ گئے کھلنے سے پہلے کس قدر کمسن گلاب
کھا گئی یہ تیرگی کتنے جوان سال آفتاب
محفلِ ہستی میں ہے شہرِ خموشاں کا سکوت
شمع کی لَو ، ریت کی دیوار ، تارِ عنکبوت
پھول کی پتی سے نازک تر ہے زنجیرِ حیات
تربتوں پر موت نے لکھی ہے تفسیرِ حیات!

چاند سلطانہ

(اہلِ وطن کو دعوتِ فکر)

اخوت کے پرستاروں کی اک رنگین دنیا تھی
حریمِ نور و نغمہ، بزمِ ناہید و ثریا تھی
وہ دنیا شمعِ آزادی کے پروانوں کی بستی تھی
جہاں فطرت سنورتی تھی جہاں مستی برستی تھی
وہ دنیا زندگی کے پھول برساتی ہوئی دنیا
ملائم نزہتوں کی رقص فرماتی ہوئی دنیا
جہاں اک سانس بھی لینے سے گھبراتے تھے ہنگامے
جلالِ بے اماں سے ڈر کے سو جاتے تھے ہنگامے
وہ دنیا رشکِ فردوسِ بریں معلوم ہوتی تھی
خدا کا شاہکارِ بہتریں معلوم ہوتی تھی
جہاں عشق و جنوں، حسن و وفا کی راجدھانی تھی
محبت مسند آرا تھی، محبت پر جوانی تھی

جہاں ایثار و خود داری کے پرچم لہلہاتے تھے
جہاں معصوم بچے موت سے آنکھیں لڑاتے تھے
مسلسل بادۂ آسودگی کے دور چلتے تھے
لہو سے پرورش پائے ہوئے ارمان نکلتے تھے
عدو جس کا خرابِ غم، شکارِ نامرادی تھا
ہر اک ساحل نشیں جانسوز طوفانوں کا عادی تھا
وہی گلشن اب اک ویرانہ آباد ہے گویا
غلافِ ساز میں لپٹی ہوئی فریاد ہے گویا
نسیمِ نگہت افشاں ہے نہ سبزہ ہے نہ لالہ ہے
یہاں کے ذرّے ذرّے کو خزاں نے روند ڈالا ہے
بلائیں عکس پیرا ہیں، مصائب گنگناتے ہیں
حوادث خیمہ زن ہوتے ہیں، فتنے سر اٹھاتے ہیں
وقارِ آدمیت۔ احترامِ آدمی کیا ہے
کوئی پوچھے یہاں کے رہنے والوں سے "خودی کیا ہے"؟
یہ نامحرم رہیں گے سوز و سازِ جذب و مستی سے
انھیں فرصت نہیں ہی خود روئی و خود پرستی سے

ہوئے ہیں بھائیوں کے خون سے روشن چراغ ان کے
اسی تجویز میں مصروف رہتے ہیں دماغ ان کے
نمک پروردۂ ابلیس، ظلم و جہل کے پالے
یہ کیڑے ہیں ندامت کی تہوں میں رینگنے والے
زمیں پر زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں آسمانوں میں
یہ غافل مطمئن ہیں اپنے اپنے آشیانوں میں
دلوں پر زنگِ نومیدی، جنوں میں ناتمامی ہے
یہاں تخریب مشرب ہے، یہاں مذہب غلامی ہے
یہ قرنوں کے ذلیل و خوار، یہ صدیوں کے زندانی
مرے نزدیک ہندستان ہے اک دوزخِ ثانی
یہ خودکامی کے سودائی، زیاں کاری کے دیوانے
کدورت سے ہیں معمور ان کی روحوں کے نہاں خانے
یہ نفرت، یہ دغابازی، یہ عیاری، یہ چالاکی
یہاں پھیلی ہوئی ہے ناصبوری و ہوسناکی
رقابت سایہ افگن ہے عداوت جلوہ آرا ہے
محبت کا نشاط آور صحیفہ پارہ پارہ ہے

اذانِ صبح کو عرصہ ہوا، اب تک یہ سوتے ہیں
یہاں دن رات خوابوں کے محل تعمیر ہوتے ہیں
یہاں دوں ہمتی کا درس ملتا ہے جوانوں کو
جگا دے خوابِ راحت سے وطن کے پاسبانوں کو
مقامِ عظمتِ عزمِ جواں سے آشنا کر دے
یہ قطرے ہیں، انھیں سیلِ گراں سے آشنا کر دے
ابھی قلعے کی دیواروں میں وہ انوار باقی ہیں
ترے ذوقِ تپش کے مضمحل آثار باقی ہیں
یہ دیواریں تری جرأت کے افسانے سناتی ہیں
ہنوز ان میں ہمالہ کی ادائیں پائی جاتی ہیں
ہنوز اُن سرفروشوں کے ترانے ہیں فضاؤں میں
تری آوازِ پا محفوظ ہے اب تک ہواؤں میں
دلِ ویراں کو مدت سے ہے تیرا انتظار۔ آجا
خدارا اے بہادر انقلابی شہسوار آجا

دعوتِ فکر

جہاں سے بے نیازانہ گزر جا یہاں ہر ساز ہے سوزِ مکمّل
مآلِ زندگی ہے تلخ کامی ترا ملبوس کھدّر ہو کہ مخمل!

ہوس کے بدنما مبروص چہرے چھپا سکتا نہیں زرّیں دوشالہ
نہ اِترا لعل و گوہر کی چمک پر یہ "گرمی" جذب کر لے گا ہمالہ!

لئے ہوتا ہے ظلمت بھی جلو میں فلک پر جب چمکتا ہے مہِ نَو
کہاں یاسِ دوامی کا اندھیرا! کہاں امید کا موہوم پرتو

زمیں سے عرش تک اک رہ گزر ہے مری ہر سانس تاریخِ سفر ہے
خرد کو نیزہ و خنجر مبارک جلالِ عشق بے تیغ و کمر ہے

نہیں تو محرم آدابِ اُلفت عطا ہو تجھ کو صہبائے نظر کیا
بغیرِ دردو داغ و سوز و مستی فغانِ صبحگاہی کا اثر کیا!

سُن اے ناآشنائے خودشناسی! کہا اک صبح نرگس نے صبا سے
وہ کانٹا جو نہیں مرہونِ شبنم ہے بہتر لالۂ رنگیں قبا سے!

مجھے ذوقِ جگرتابی عطا کر تمناؤں کو شادابی عطا کر
ہر اک ذرّے کو میں بیدار کردوں وہ درمانِ گراں خوابی عطا کر!

شاعرِ مشرق اور بندۂ محکوم

محکوم

اے ترے نغموں سے روئے حاکمیت بے حجاب
یہ زوالِ مردِ مومن ہے حقیقت یا کہ خواب
مٹ گئی وہ محفلِ عزم و عمل مثلِ سراب
سنگِ خارا ہوگیا ہے زندگی کا لعلِ ناب
کیا ملے کیوں کر ملے گم گشتہ منزل کا سراغ
ساحرانِ فرنگ کے مسحور ہیں سب شیخ و شاب!

شاعرِ مشرق

آ، بتاؤں تجھ کو شانِ عارف و مردِ تمام
وارثِ دینِ مبین، آتش نسب، والا مقام
عشق رزمِ زندگانی، عشق تیغِ بے نیام
عشق کی گرمی سے پیدا تابشِ کاس الکرام
اب کہاں وہ عشق و مستی کا جمالِ جاوداں
وہ جنونِ دعوتِ حق، وہ خیالِ ننگ و نام

اب کہاں وہ عشق و مستی کا جلالِ بے اماں
مردِ مومن کو مبارک ہو نمازِ بے قیام
کاروانِ عشق پہونچا منزلِ مقصود پر
ہیں خرد کے کارواں لیکن ابھی دور از مقام
آتشِ افرنگ کے شعلوں میں گھر کر رہ گیا
مکتبِ اسرارِ فطرت کا جوانِ سبز فام
عشق نے مجھ کو عطا کی سوزشِ دردِ دردل
تھا مرے افکار کا سرمایہ سوزِ ناتمام!

محکوم

یاد ہے مجھ کو ابھی تک وہ ترا حرفِ بلند
کر دیا بحرِ معانی تو نے اک نقطے میں بند
بندۂ محکوم کو کیا ہو اسیری سے خطر
"قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند"

شاعرِ مشرق

تیرا قلبِ پُر سکوں تھا محوِ وردِ لا الٰہ
آج ہے بے ربطیٔ افکار کی آماجگاہ

اے اسیرِ جہل و عصیاں! ناشناسِ زندگی!
پستیٔ فطرت سے ہے تو بے گلیم و بے کلاہ!

محکوم

بادۂ آلام سے پُر ہے ایاغِ زندگی
کس طرح روشن ہو مومن کا چراغِ زندگی؟

شاعرِ مشرق

اس کی ہے شاہنشہی دنیائے مہر و ماہ پر
تیز ہے تیغِ دو پیکر کی طرح جس کی نظر
جس کی فطرت بے نیازِ گردشِ شام و سحر
جس کی ہستی کامیابی کا جمالِ منتظر
جس کے حق میں پھول بن جاتا ہے ہر خارِ ضرر
ہے وجودِ ذاتِ باری کا وہی پیغامبر!
بندۂ آزاد کی آواز صوتِ سرمدی!
بندۂ محکوم کی آواز بالکل بے اثر!
خاکِ محکومی سے گرد آلود ہے تیری جبیں
زندگی خودداریوں کا نام ہے اے بے خبر!!

چاند کا تبصرہ

(ارضِ مشرق پر)

پھرا ہیں مشرقِ عظمیٰ کے فتنہ زاروں میں
کسی پہ فاش نہیں مرگ و زیست کا مفہوم
یہ رنگ و نسل کے تاجر، قیادتوں کے امام
دماغ "فکر" سے خالی ہیں، سوز سے محروم
سکھا رہے ہیں یہ شیروں کو طرزِ روباہی
گداگری تو ہے احسن، قلندری مذموم
ہیں ان کی روح میں بوسیدہ مقبروں کے کھنڈر
یہ زندہ ہیں مگر آثارِ زندگی معدوم
یہ بے بصر دہ "پرانے غلام ہیں کہ جنھیں
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

امیدوار ہے الطافِ شہریاری کا
یہ "خود فروش قبیلہ" یہ امتِ مرحوم

یقیں نہ ہو تو ہے بے سود سعیِ آزادی
میں جانتا ہوں رہیں گے یہ تا ابد محکوم

شکوہِ عشق کہاں اب دیارِ مشرق میں
ہوائے دانشِ حاضر سے ہے جنوں مسموم

یہاں سکوت مسلط ہے ذرّے ذرّے پر
ترانہ ریز ہوا سازِ شام و بربطِ روم

نہ ڈھونڈھ خلوتِ تسکینِ رنگ و بو کہ یہاں
خزاں ہے جنتِ دل، خلدِ گوش نوحۂ بوم

جو سر بلند پہاڑوں کو چیر سکتی تھی
اب اُس نظر سے ہے خاتونِ ایشیا محروم

قیامتِ دگرے در بطونِ ایّام است
کہ آسماں ہے دگرگوں، سلگ رہے ہیں نجوم

کرے گی فطرتِ ہستی جہانِ نو تعمیر
ضمیرِ ارض میں پاتا ہوں زلزلوں کا ہجوم!

جنّت

جہاں سخت کوشی ہے اک لفظِ مہمل — جہاں عیش و عشرت سے فرصت نہیں ہے
جہاں سرنگوں ہے امیدوں کا پرچم — جہاں سوز و سازِ محبت نہیں ہے
جہاں "زندگی" کو ترستا ہے انساں — جہاں عشق مستی کی دولت نہیں ہے
جہاں سلسلہ ہے تن آسانیوں کا — جہاں خود شناسی کی مہلت نہیں ہے
جہاں کوئی واقف نہیں ہے "نظر" سے — تجلّی جہاں "عینِ فطرت" نہیں ہے
جہاں جلوہ آرا ہیں "فرسودہ حوریں" — جہاں حسن کی کوئی وقعت نہیں ہے
جہاں خیمہ زن ہیں "معمر فرشتے" — جہاں "آدمی" کی ضرورت نہیں ہے
نہیں ہے شعور و تدبّر کی خوشبو — خلوص و مروت کی نکہت نہیں ہے
جہاں وہ ریا کار ہیں مسند آرا — جنھیں صاف گوئی کی جرأت نہیں ہے
جہاں کم سواد اہلِ زر حکمراں ہیں — جہاں مفلسوں کی حکومت نہیں ہے

تو افسردہ "جنت" ہماری نظر میں
سراسر جہنم ہے! جنت نہیں ہے!

فراق

وادیٔ کوہ و جوئبار خموش
دشت خاموش، لالہ زار خموش
چاندنی رنگ و نور سے عاری
ماہ و انجم پہ بے خودی طاری
بے قراری سی ابر پاروں میں
جان باقی نہیں ستاروں میں
یہ سکوتِ سپہرِ مینائی
روح فرسا ہے شامِ تنہائی
صرفِ آہ و فغاں نہ ہو جائے
زندگی کا دھواں نہ ہو جائے!

کربلا

جہاں میں گرچہ فروزاں ہے آتشِ نمرود
ہے کربلائے مقدس ابھی گلاب آلود

یہ سرزمیں کہ درخشاں ہے ماہ و پرویں سے
چمک رہی ہے سکینہؑ کے اشکِ خونیں سے

شفق طراز ہے شبیرؑ کا لہو اب تک
یہ ریگ زار ہے اے دوست شعلہ رُو اب تک

کسی خیال میں کھویا ہوا یہ ویرانہ
سنا رہا ہے یقین و وفا کا افسانہ

متاعِ زیست بس اک سوزِ اندروں ہی یہاں
غرورِ افسر و اورنگ سرنگوں ہے یہاں

خودی کی برق نگاہی سے ہو گیا برہم
شکوہِ نیزہ و خنجر، وقارِ تاج و علم

نہ پوچھ شوقِ شہادت کی حشر سامانی
گڑی ہوئی ہے یہاں صولتِ جہاں بانی

یہاں ہے رعشہ براندام نازِ حشمت و جاہ
ازل سے تا بہ ابد لا الٰہ الّا اللہ

ہیں اس فضا میں ابھی پرفشاں وہ تکبیریں
خلوص و عزم و عمل کی برہنہ شمشیریں

یہاں خرد کو ہے احساس ناتمامی کا
گدازِ عشق ہے عنوان تشنہ کامی کا

یہ انجمن ہے جواں سال آفتابوں کی
رُکی رُکی ہے یہاں نبض انقلابوں کی

یہاں جو آئے "سراپا بہار" ہو جائے
فرشتہ صید و پیمبر شکار ہو جائے

یہ بزمِ صدق و صفا۔ یہ مقامِ شبیرؑ ہی
یہاں نقاب کشا ہے "دوامِ شبیری"

یہ رزم گاہ ہے چرخ بریں کی ہمپایہ
ہر ایک ذرّے پہ ہے ذوالفقار کا سایہ
دلِ فرات ہے مصروفِ شور وشین ہنوز
بطونِ ساز میں ہے ماتمِ حسینؑ ہنوز
دیارِ صبر ورضا میں اجل کو راہ نہیں
شہید کون ہے جو زندگی پناہ نہیں
جمالِ عشق سے پردے اُٹھائے جائیں گے
یہاں کی خاک سے انساں بنائے جائیں گے!

عشق

ہاں بہوش اے خاک و باد! اے آفتاب! اے ماہتاب!
عشق کے رُوئے منور سے اُٹھاتا ہوں نقاب

عشق کیا ہے؟ شعلہ و شبنم کا رنگیں امتزاج
عشق لیتا ہے فلک فرسا دشاہوں سے خراج

عشق طاؤسِ مسرت بھی، نفیرِ غم بھی ہے
آدیہ آزادِ غم بھی ہے، اسیرِ غم بھی ہے

عشق نورِ زندگی ہے، عشق نارِ زندگی
نور و نارِ زندگی۔ پروردگارِ زندگی

ہے متاعِ عشق صرف اک آرزوئے ناصبور
جلوہ زارِ عشق آبادی کے ہنگاموں سے دور

نزہتِ شاخِ نشیمن، بجلیوں کا پیچ و تاب
اس کی فطرت بیقراری، اس کے آنسو لعلِ ناب

چاند کا نغمہ، ستاروں کا ترنم، بوئے گل
عشق ہی دارائے عالم عشق ہی مولائے کل
گاہ شادابِ حقیقت، گاہ بیتابِ مجاز
موسمِ گرما کی فرحت ناک راتوں کا گداز
تیتری کا رقص، پروانے کا اندازِ جنوں
آبجو کا گیت، کوئل کے ترانوں کا فسوں
عشق فصلِ گل فشانی، عشق ابرِ نوبہار
وقت کی پرواز، ہیرے کا جگر، خنجر کی دھار
مانگتے ہیں بارگاہِ عشق سے عیشِ ازل
شام کے سیمیں دھندلکے، صبح کے تازہ کنول
عشق کا سیلِ تجلیات ہے آدم فروز
ساز کی آواز میں دبکی ہوئی اک موجِ سوز
ضوفشاں ہے کوہسارِ طور پر فانوسِ عشق
گونجتا ہے وادیِ لاہوت میں ناقوسِ عشق

عشق سے تیغِ محمدؐ، عشق سے چوبِ کلیمؑ

عشقِ یزدانی لبوں کا اک تبسم ہے ندیمؔ!

جھوم کر جب عشق پڑھتا ہے زبورِ انقلاب

دوڑ جاتا ہے عروقِ پیر میں خونِ شباب

عشق ذوقِ تازہ کاری، عشق پیکارِ حیات

بے سرورِ عشق انساں باربردارِ حیات

پھر ترے جذبِ دروں سے منحرف ہے کائنات

اے خدائے شور و مستی! اک نگاہِ التفات!

اعلانِ بغاوت

کواکب کی تابندگی مضمحل
پریشاں ہے دل، زندگی مضمحل
فلک سرنگوں، ابر پارے خموش
ہر اک ذرۂ خاک ماتم فروش
زمیں کہنہ ہے، چرخ فرسودہ ہے
ہر اک شے یہاں زنگ آلودہ ہے
یہاں ہر قدم پر ہے اک سومنات
غلامی کی تاریک پُرہول رات
یہ طوفان گاہیں، یہ سیلاب زار
اُجالے ہیں تاریکیوں پر نثار
بہر گام احساس وعرفاں کی لاش
یہ ناسور، یہ آنسوؤں کی خراش
وہی خانقاہوں کے "جبریل وحور"
وہی گردِ منزل، وہی برق طور
یہ انساں، یہ مقتولِ دیر وحرم
رواں جس کی رگ رگ میں زہرابِ غم
حوادث کے شعلے، مصائب کی آگ
مگر لُٹ گیا زندگی کا سہاگ
کوئی حد نہیں ہے غم و یاس کی
ہر اک رُخ پہ جُھریاں ہیں افلاس کی
یہ آسودگی تا کجا "عرش" پر
ذرا جانبِ "فرش" بھی اک نظر
میں تیرے ستم دیکھ سکتا نہیں
اب آنکھوں میں نم دیکھ سکتا نہیں

نیا نقش بن کر اُبھرتا ہوں مَیں
بغاوت کا اعلان کرتا ہوں مَیں!

خمارِ انجام

نظر نظر میں جراحت، نفس نفس میں شرار
قدم قدم پہ یقین و خود آگہی کے مزار
پہن چکی ہے زمیں یاس کا سیاہ کفن
خزاں کی گود میں ہے محوِ خواب روحِ چمن
رہا میں خاک بسر آج تک برائے سکوں
نہ کر سکی مجھے فطرت بھی آشنائے سکوں
نہیں ہیں محرمِ انساں یہ صبح و شام ابھی
کہ ماہ و شمس کی گردش ہے ناتمام ابھی
ہزار زخم ہیں انسانیت کے سینے میں
بھڑک رہے ہیں جہنم اس آبگینے میں
اجل کے شور میں گم ہو گیا سرودِ حیات
گسستہ تار ہیں چنگ و رباب و عودِ حیات

اماں ملی نہ قضا و قدر کے ماروں کو
نگل چکا ہے اندھیرا شہاب پاروں کو
صباحِ زیست پہ طاری ہے رات صدیوں سے
اُگل رہی ہے دھواں کائنات صدیوں سے
ستم زدوں نے لُٹا دی متاعِ قلب و ضمیر
سیاہیوں میں ہیں ابنائے آفتاب اسیر
کسی کے بس میں نہیں دردِ زندگی سے نجات
ہلاک تشنہ لبی ہیں بناتِ نیل و فرات
دل و نظر کے کنول بارہا جلائے ہیں
عروسِ ارض و سما کے نقاب اُٹھائے ہیں
وہی ہے محفلِ ہستی کی تیرہ سامانی
ہوا نہ سیر مرا ذوقِ گل بداماں
رہی نگاہ گرفتارِ منبر و محراب
الٰہیات کے پردے اُلٹ سکا نہ شباب

گزر چکے ہیں بہت کارواں رسولوں کے

روش روش پہ جنازے پڑے ہیں پھولوں کے

نہا کے خون میں جھوٹے رسول نکھرے ہیں

ہر ایک سمت جنازوں کے پھول بکھرے ہیں

ترا جہاں ہے کہ مدفن ہے آدمیت کا

سراغ مل نہ سکا منزلِ حقیقت کا

جبیں پہ داغ ہیں قرنوں کی جبہہ سائی کے

کہ ناز اُٹھائے ہیں میں نے تری خدائی کے!

ناسُور

یہ سموم جہل و عصیاں، یہ ہوائے انقلاب
کون جانے بجھ گئے کن گلعذاروں کے شباب
یہ امارت کا اندھیرا، یہ سیاست کا خروش
کون جانے ہیں یہاں کتنے ارم خاشاک پوش
پھول پر جورِ خزاں، کانٹوں میں طوفانِ نمو
پی چکا ہے آسماں کتنے اماموں کا لہو
یہ تلاطم، یہ رُخِ ہستی پہ قرنوں کی خراش
آدمیّت کا جنازہ، عصمت و ایماں کی لاش
سنگ و آہن کے پجاری لعل و گوہر کے مرید
کون جانے اِس جہاں میں دفن ہیں کتنے یزید
خاک و خوں کی مرگ آور آندھیاں چلتی رہیں
صبح کی آغوش میں تاریکیاں پلتی رہیں

تیرگی لیتی رہی مظلوم روحوں کا خراج
کتنی آنکھوں کے ستارے، کن جہانگیروں کے تاج
کوڑھ کے داغوں پہ یہ تزئینِ کمخواب و سمور
علم و حکمت کی سیاہی، کج کلاہی کا غرور
یہ بھڑکتے کھیت، وحشی بجلیاں، جلتے نجوم
نادر و تیمور کے سفاک چیلوں کا ہجوم
بن گئی ہے طغرل و فغفور کی چینِ جبیں
عفتوں کے خون میں بھیگی ہوئی تپتی زمیں
حیدر و ٹیپو کی قبروں سے دھواں اُٹھتا رہا
پیچ و خم کھا کر زمیں سے آسماں اُٹھتا رہا
نور سے عاری رہے عرفان و دانش کے چراغ
پھٹ گئے رستے ہوئے ناسور کی بو سے دماغ
آہ یہ ہنگامۂ دیر و کلیسا و حرم
آدمی سہتا رہا جابر خداؤں کے ستم

حسرتوں کی یورشیں، برق و شرر کا اژدہام
پیکرِ خاکی ہے اب بھی نامراد و ناتمام
نوحہ خواں ہے وقت کے جنگل میں روحِ کائنات
عارض و گیسو کے نغمے گا نہیں سکتی حیات
ہاں، یونہی لُٹتا رہے فردوسِ ارضی کا سہاگ
حشر ساماں زلزلے گاتے رہیں دُوزخ کے راگ
جلوہ گاہِ زندگی بے نور و ویراں ہے ابھی
آہ یہ انساں فقط امیدِ انساں ہے ابھی!

شبخون

زیست اک نوحۂ دلدوز ہوئی جاتی ہے
نکہتِ گل بھی جگر سوز ہوئی جاتی ہے

ایک اک گام پہ ہے مرحلۂ دار و رسن
موسمِ گل میں بھی عریاں ہیں شگوفوں کے بدن

کون جانے مرے احساس پہ کیا بیتی ہے
چاندنی خودئہ واخترکا لہو پیتی ہے

یہ الم ناک سیاہی، یہ بیاباں، یہ ہول
وہ چمکتی ہوئی کلیاں، وہ مہکتے ہوئے پھول

وہ بہارِ چمنی ہے نہ چمن باقی ہے
اور ابھی وقت کے ماتھے پہ شکن باقی ہے

بجھ گئے حسن و صداقت کے سحر تاب کنول
رقص کرتی ہے تمناؤں کی لاشوں پہ اجل

آس کے راگ، محبت کے ترانے نہ رہے
عشق و ایماں کے جنوں ریز فسانے نہ رہے
چاند کا گیت، ستاروں کا ترنّم نہ رہا
لبِ ہستی پہ وہ ضو بار تبسّم نہ رہا
صید کے بھیس میں پھرتے رہے کتنے صیّاد
کھو گیا قافلۂ عظمتِ پرویز و قباد
عود و عنبر کا دھواں مصحف و منبر کے سراب
بجھ گئے "صرصرِ تقدیس" سے کتنے مہتاب
اُڑتا جاتا ہے رُخِ عصمتِ ادراک سے رنگ
ہائے یہ زنگ، یہ تہذیب و روایات کا زنگ
زندگی سوزِ حقیقت سے گریزاں ہے ابھی
ایک اک سانس یہاں شعلہ بداماں ہے ابھی
جلوۂ حسن نمایاں ہے کہ مستور نہ پوچھ
کس قدر سینۂ فطرت پہ ہیں ناسور نہ پوچھ

ابھی جاری ہے وہی کشمکشِ وہم و یقیں
خوں فشاں ہیں زر و گوہر کے خداؤں کی جبیں
یہ سلگتے ہوئے اہرام، یہ بجھتے ہوئے دل
آج بھی دور ہے آنکھوں سے چراغِ منزل
پھر وہی زخم، وہی مرہمِ قربانی و حج
ظلمتِ فکر و جبر کھا گئی کتنے سورج
کس قدر ہم پہ مشیت نے نوازش کی ہے
پاسبانوں ہی نے شبخون کی سازش کی ہے!

پناہ

اب نہیں محفلِ ہستی کی ضرورت مجھ کو
کس قدر عصمت و انصاف کے ڈاکو ہیں یہاں
کتنے اسکندر و چنگیز و ہلاکو، ہیں یہاں
یاس کی گود میں خوابیدہ ہیں آہیں کتنی
ڈھل گئیں موت کے نغموں میں کراہیں کتنی

اُف یہ انساں، یہ طلسماتِ صنم زار و حرم
(اور بھی خاک پہ ہو شعلہ فشاں ابرِ کرم!)
وہی افلاس، وہی انجمنِ میر و وزیر
آہ یہ صبح کے ماتھے پہ تلاطم کی لکیر
آہ یہ روئے ہوس پر زر و گوہر کے نقاب
کتنے کانٹے ہیں گلابوں کے لہو سے شاداب
ذرے ذرے پہ ستم کاریٔ مریخ و سموم
یہ حوادث کا تواتر، یہ مصائب کا ہجوم

گلستانوں میں لہو، آئینہ خانوں میں لہو
فکر و احساس یہاں خون سے کرتے ہیں وضو
جہل و عصیاں کی گھٹائیں ہیں ابھی حشر بدوش
زندگی مہر بلب، نورِ حقیقت روپوش
ظلم ڈھایا ہے شگوفوں پہ صبا نے کیا کیا
کھو گئے روح کی چیخوں میں ترانے کیا کیا
وہ سیاہی ہے کہ ملتا نہیں تاروں کا سراغ
اُف یہ تہذیب کی شمعیں، یہ تمدّن کے چراغ
علم و عرفان کے ہیں ہر گام پہ مدفن کتنے
جل گئے فصلِ بہاری میں نشیمن کتنے
یہ قیادت کے پرستار۔ امامت کے شکار
کتنے فردوس ہیں اس دہر میں دوزخ بکنار
یہ فضاؤں میں جو طوفان سے لہراتے ہیں
جرم و جاگیر کے ناسور نظر آتے ہیں

خانقاہوں میں یہ آئینہ ضمیری کے فریب
اُف یہ سلطانی و ملّائی و ہیری کے فریب
کس کے سینے میں وفورِ غم و آلام نہیں!
کونسا دل ہدفِ گردشِ ایام نہیں!
ہے ترا جلوۂ صدرنگ مری مشعلِ راہ
ڈھونڈتا ہوں تری مہکی ہوئی خلوت میں پناہ
اپنی آغوش میں لے مادرِ فطرت مجھ کو!

کب تک

زندگی سربگریباں ہے زمیں روتی ہے
تو ہے بیدار۔ تری شانِ کرم سوتی ہے

جوشِ خاشاک سے تاریک ہیں کتنی راہیں
دیکھ سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ لرزتی آہیں

دیکھ یہ سوزِ دروں، دیکھ یہ اشکوں کی قطار
دیکھ ہر سانس میں یہ سلسلۂ برق و شرار

شاہراہوں پہ ہیں سڑتی ہوئی لاشیں کتنی
دیکھ۔ ہیں عارضِ ہستی پہ خراشیں کتنی

دیکھ یہ نزہت وانوار کے ذی رُوح مزار
جنّتیں ہیں تری دنیا میں جہنّم بکنار

ہیں زبوں حال تجھے پوجنے والے کتنے
دیکھ آوارۂ افلاک ہیں نالے کتنے

تیرہ بختوں سے گریزاں رہی تنویرِ حیات
دیکھ یہ وسعتِ برباد، یہ زنجیرِ حیات
لالۂ طور ہے باقی نہ کوئی موسیٰ ہے
صبح نے اپنے ہی سورج کا لہو چوسا ہے
ہیں یہاں گرمیٔ احساس سے عاری کتنے
دام افگن ہیں تمدّن کے شکاری کتنے
صاحب دانشِ و فرہنگ ہے خود قاتلِ ہوش
کتنے خورشید جہاں تاب ہیں ظلمات بدوش
ہر طرف صرصر و مرّیخ اذاں دیتے ہیں
پھول ہیں مہر بلب، ساز دھواں دیتے ہیں
باز آ شعلہ طرازی سے اب اے ربِّ جلیل
تجھ سے نالاں ہیں ترے خاک نشیں عبدِ ذلیل
قلزم زیست میں پُر ہول جزیرے کب تک!
جگمگائیں گے ترے تاج کے ہیرے کب تک!!

فرار

ڈال دو اے گلعذارو! اپنے چہروں پر نقاب
ہاں اُٹھا رختِ سفر اے کاروانِ انقلاب
پیس ڈالا حسرتوں کو گردشِ ایّام نے
عشرتِ دوراں سے کہدو اب نہ آئے سامنے
زندگی و آگہی کے پھول چُن سکتا نہیں
ہم میں کوئی وقت کی آواز سن سکتا نہیں
ناچتی ہیں وحشتیں پہنے ہوئے شعلوں کے ہار
اس گلستاں سے گریزاں ہی رہا ابرِ بہار
متّصل بڑھتی رہی آویزشِ عقل و جنوں
کس قدر آئینہ خانے ہو گئے ہیں سرنگوں
کفر و ایماں دے رہے ہیں بربریت کا سبق
منتشر ہیں چار سو تاریخ کے خونیں ورق

قبر کی تاریکیوں میں کھو گئے کتنے شباب
ہیں بطونِ ساز میں کتنے ترانے محوِ خواب
کس قدر ضو بار تارے ٹمٹما کر رہ گئے
یاس کی موجوں میں ہستی کے سفینے بہہ گئے
کس قدر غم روح میں پل کر جواں ہوتے رہے
آرزوؤں کے چمن صرفِ خزاں ہوتے رہے
کتنے دل، کتنے شگوفے وقفِ پامالی رہے
کتنے پیمانے شرابِ شوق سے خالی رہے
کب سے جاری ہے سکونِ یک نفس کی جستجو
اشک بن کر بہہ رہا ہے کتنی آنکھوں سے لہو
چاند سورج میں اندھیرے پرورش پاتے رہے
دولت و ثروت کے اندھے سانپ لہراتے رہے
کتنی شمشیروں پہ ہے معصوم طفلی نوحہ گر
کتنی تلواروں نے چاٹا ہے جوانی کا جگر

ریشمی پوشاک میں ہیں کتنی روحیں تار تار
کتنے برقعوں[1] میں چھپے ہیں شرم و غیرت کے مزار
آسماں سے زہر برساتے رہے کتنے زحل
نذرِ صرصر ہو چکے ہیں کس قدر نورس کنول
خون میں ڈوبی ہوئی ہیں رشکِ جنت وادیاں
بیچتی پھرتی ہیں عصمت کتنی مریم زادیاں
چڑھ گیا ہے روح پر صدیوں کی ناکامی سے زنگ
اب نہ دے ٹوٹے ہوئے دل کو نویدِ آب و رنگ!

---

[1] اُردو میں "برقعا" صحیح ہے (انشاء)

لہو ترنگ

دیکھ وہ پہلی کرن پھوٹی وہ اُبھرا آفتاب
تابہ کے اے ہمنشیں یہ سنبل و ریحاں کے خواب

کیا خبر تجھ کو کہ یہ صدیوں کی بوڑھی کائنات
سو رہی ہے اپنے پہلو میں لئے نعشِ حیات

آہ یہ تقدیر، یہ زائیدۂ لوح و قلم
ولولوں کی نرم شریانوں پہ رکھتی ہے قدم

غالب آئی بے خودی اکثر مرے ادراک پر
میں نے دیکھا موت کا تاریک سایہ خاک پر

میں نے دیکھا اوس کو مغموم، شاخوں کو اداس
چند اشکوں کے سوا اب کچھ نہیں پھولوں کے پاس

میں نے دیکھا مہوشوں کو غم سے رشتہ جوڑتے
معرفت کو جہل کی آغوش میں دم توڑتے

کتنے دل آتش بداماں، کتنی آنکھیں "لالہ فام"
کتنی آہیں بے اثر، کتنی دعائیں ناتمام

کتنے سینوں میں فروزاں عسرت ونکبت کی آگ
کتنے ہونٹوں پر درخشاں نقرہ ونیلم کے راگ

کب سے ذہنوں پر مسلّط ہے طلسمِ زشت وخوب
کتنے سورج ہو گئے ہیں شام سے پہلے غروب

زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں
آہ کیا کیا شاہکارِ گردشِ ایام ہیں

ایک انساں کی ہلاکت کا اور اتنا اہتمام!
کھا گیا شائد دماغِ کبریائی کو جذام

کوہ تتلی کے مقابل ہو صف آرا۔ ہائے ہائے
بادلوں کی زد میں اک ننھا ستارا۔ ہائے ہائے

کس طرح چھینا گیا جامِ مئے باقی۔ نہ پوچھ
اس تجلّی پر خدا کا زعمِ رزّاقی نہ پوچھ

ٹمٹماتی، جھلملاتی رہ گئی شمعِ ضمیر

اب خدا ابراہیم ہے نمرود گردی کا اسیر

معجزے سر در گریباں ہیں، صحائف گرد پوش

آدمی بیتاب، شیطاں مضمحل، یزداں خموش

دل کو ان جھل تمناؤں میں اُلجھاتا ہے کیوں

آس کے رنگیں کھلونے دے کے بہلاتا ہے کیوں

اس زمانے میں کوئی حسرت نکل سکتی نہیں

آگ اب ناداں! شگوفوں میں بدل سکتی نہیں!

جرعۂ اولیں

قلقل کا یہ نالۂ طرب ناک
رقصاں ہے ضمیرِ ارض و افلاک

اُف رطلِ گراں کی سحر کاری
احساس پہ بے ہشی ہے طاری

اعجاز ہے دخترِ رز کا اعجاز
میں عرش پہ کر رہا ہوں پرواز

یہ فصل، یہ شعریت، یہ ماحول
ایسے میں غمِ نجات۔! لاحول

ہر نغمہ ہے جبرئیل آشوب
نقارۂ دل کے واسطے چوب

ہر ساز ہے سازِ عشق و مستی
مستی میں ہے غرقِ بزمِ ہستی

سرشار ہیں پھول، ٹہنیاں مست
بیخود ہے زمین، آسماں مست

طاؤس و رباب و عود و نے مست
تا حدِّ نظر ہر ایک شے مست

نظارہ و ناظر و نظر مست
دل مست، دعائیں مست، اثر مست

ہر لالۂ کیف آفریں مست
کوئل کی صدائے نازنیں مست

قمری کی فغانِ بے شرر مست
بلبل کی نوائے کارگر مست

صحرا صحرا جبل جبل مست   دریا دریا، کنول کنول مست

قلبِ صدف و دلِ گہر مست   ہر رند ہے سرفراز و سرمست

ناقوس واذاں کا زیر و بم مست   مدہوش صنم کدہ، حرم مست

تقدیر کی جوئے نرم رو مست   قندیلِ خود آگہی کی لو مست

امواجِ نسیم و بوئے گل مست   فطرت کا ہر ایک جزو و کل مست

یکساں ہیں بلند و پست ساقی

ہے آج خدا بھی مست ساقی!

قیامت

اجل تخریب کے پُر ہول نغمے گانے والی ہے

ابھی تاریخ اپنے آپ کو دُہرانے والی ہے

یہ ایں وحدانیت لاانتہا اصنام باقی ہیں

ابھی تو زندگی کے سیکڑوں اہرام باقی ہیں

ابھی تاریکیاں زحمت کشِ فانوس و مشعل ہیں

ابھی تو زلزلے خام اور دُھندلکے نامکمل ہیں

جہاں پر حکمرانی ہے ابھی اسفندیاروں کی

خبر لیتا نہیں کوئی ابھی قسمت کے ماروں کی

ابھی تو معرضِ خلقت میں ہیں مغموم ویرانے

فنا کی وحشت آئینی سے چمکیں گے پری خانے

ابھی تو نزہت و نگہت کے طوفاں آنے والے ہیں

ابھی تو خاک پر افلاک ہُن برسانے والے ہیں

ابھی تو عصمت و ادراک کا دامن دریدہ ہے
ستاروں کا حیات آگیں ترنم ناشنیدہ ہے
زمانے پر تسلط ہے ابھی میری و شاہی کا
اثر ہوتا نہیں جمہور کی آتش نگاہی کا
ابھی دنیا میں پانی سے زیادہ خون سستا ہے
ابھی تو یہ دُرِ ناسفتہ سُورج کو ترستا ہے
ابھی ہے "آدمی" کا منتظر معمورۂ ہستی
ابھی تو اپنی خلوت ہی میں ہے ناظورۂ ہستی
ابھی تو خاکداں کو نور و ظلمت میں سمونا ہے
ابھی تو گردشوں کو طرزِ نو ایجاد ہونا ہے
ابھی سیلاب خوابیدہ ہیں دریاؤں کے سینوں میں
چٹانیں تربیت پاتی ہیں نازک آبگینوں میں
ابھی تو خندہ زن ہے اہرمن یزداں شکاروں پر
ابھی تو کشتیاں چکرا رہی ہیں تیز دھاروں پر

سناتی ہیں ابھی کلیاں حدیثِ نیزہ و خنجر
ابھی تو کھلنے والا ہے فریب طغرل و سنجر

یقین و کفر کے فتنے اُٹھیں گے خانقاہوں سے
گزرنا ہے ابھی تو یاس کی سنگین راہوں سے

شہید ناتمامی ہے ابھی انساں کی برنائی
ابھی تو نیلِ وفاراں کی تمنّا بر نہیں آئی

ابھی ہر سانس ہے اک آئینہ سوز و جراحت کا
ابھی سے انتظار اے ہمنشیں صبح قیامت کا!

مئی کی ایک دوپہر

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

شام ضو ریز نہیں، صبح پُر انوار نہیں

سرو آزاد نہیں، نرگسِ بیمار نہیں

رونقِ صحن و جمالِ در و دیوار نہیں

دولتِ عشق نہیں، نعمتِ دیدار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

کل یہاں خلد سے ہوتا تھا شگوفوں کا نزول

آج تکلیفِ نظر حدِ نظر تک ہے ببول

عرصۂ دہر ہے پژمردہ و بے کیف و ملول

عیشِ گلزار نہیں، عشرتِ کہسار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

گوشہ گوشہ ہے یہاں حلقۂ صد کامِ نہنگ
دلِ ہر ذرّہ میں پیوست ہیں صرصر کے خدنگ
کونسا پھول نہیں نوحہ گرِ رامش و رنگ!

کونسی شاخ ہے گلشن میں، جو تلوار نہیں
اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

ہوگیا مے سے تہی رطلِ گراں اے ساقی
اب کہاں وہ مری فردوسِ رواں اے ساقی
کونسی آنکھ نہیں دجلہ فشاں اے ساقی!

کونسا دل غمِ گیتی سے گراں بار نہیں!
اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

اب وہ سوزِ فلک افروز نہیں تاروں میں
اب وہ پہلا سا ترنّم نہیں قوّاروں میں
نگہۂ شوق بھٹکتی ہے سمن زاروں میں

اب ہیں کہنے کو سمن زار۔ سمن زار نہیں
اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

ہیں صنوبر کے لرزتے ہوئے سائے خاموش
تتلیاں رقص کناں ہیں نہ ہوا بادہ فروش
زندگی سر بگریباں ہے، تمنا روپوش
لذتِ شوق نہیں مستیٔ بیدار نہیں
اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

اب نہیں موجِ نظر حیرتیٔ سیم و سمن
چار سو یاس کے پرچم ہیں امیدوں کے چمن
اوس کی بوند پہ رقصاں تو ہے سورج کی کرن
آہ لیکن یہ کرن زرد ہے، گلنار نہیں
اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

جستجوئے گل و بلبل میں پریشاں ہے نسیم
اب کہاں شبنمِ آوارہ میں روحِ تسنیم
اب نہ وہ سبزۂ نورستہ نہ غنچوں کی شمیم

اب وہ طوطی نہیں، دُرّاج نہیں ساز نہیں
اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

اب نہ وہ موسمِ نغمہ ہے نہ وہ فصلِ شباب
غنچگیٔ رُخ سے اُلٹنے بھی نہ پائی تھی نقاب
اُڑ گیا قافلۂ لالہ و نسرین و گلاب

شعلۂ ساز نہیں، ابرِ گہر بار نہیں
اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

انساں کی چیخ

کروٹیں بدلی ہیں کیا کیا گردشِ ایام نے
تیر برسائے ہیں مجھ پر کس قدر آلام نے
یہ حریمِ جان و دل، یہ رقص گاہِ زندگی
کھو گئی ہے پیچ و خم میں شاہراہِ زندگی
یہ جلالِ میر واعظ، یہ شکوہِ برہمن
سُرخ پرچم بن گئے ہیں کتنی صبحوں کے کفن
بت کدوں کی فتنہ سازی، خانقاہوں کے فریب.
یہ خیالِ دوریٔ منزل، یہ راہوں کے فریب
زاہدوں کا شور و شر، زنار داروں کا ہجوم
اُف یہ آدم زاد، یہ آدم شکاروں کا ہجوم
اک مسلسل تیرگی ہے۔ اب یہاں دن ہے نہ رات
بے قراری کا نشیمن بن گئی ہے کائنات

سینۂ احساس میں پیوست ہیں کتنے خدنگ
کھا گیا نورِ سحر کن خاورستانوں کا رنگ

یہ تمناؤں کے مدفن! آرزوؤں کے سراب!
کب اُٹھایا جائے گا روئے حقیقت سے نقاب!

آج تک میری دعا، "وہم اثر" بنتی رہی
اوس کی ہر ہر بوند اک موجِ شرر بنتی رہی

آنسوؤں سے بارہا میں نے سنوارا ہے تجھے
شورشِ ہستی سے گھبرا کر پکارا ہے تجھے

یاس کے طوفان میں کتنی امیدیں بہہ گئیں
حسرتیں دل کے لہو میں غرق ہو کر رہ گئیں

بے کسی فرمانروا ہے عالمِ اسباب میں
پھنس گئی ہیں کتنی روحیں وقت کے گرداب میں

نامکمل ہے ابھی یہ اہتمامِ خشک و تر
ایک مدت سے سلگتے ہیں شگوفوں کے جگر

اس چمن میں کس قدر آتش کدے مستور ہیں
کون سمجھائے کہ یہ غنچے نہیں، ناسور ہیں
دیکھ اے رزّاقِ عالم! اے خداوندِ قدیر!
فاقہ کش ہیں اس جہاں میں کس قدر صاحب ضمیر
کشتۂ زاغ و زغن ہیں چرخ پیما شاہباز
بے بہا موتی اُٹھاتے ہیں خزف ریزوں کے ناز
کتنے جبریلِ امیں ہیں مدح خوانِ اہرمن
شبنمِ بے عمر ہے سیلِ گراں پر خندہ زن
دشت ہیں جنت بداماں، گلستاں خاشاک پوش
برق پارے ہیں یہاں ظلمات کے حلقہ بگوش
روزِ روشن پر ہے وحشت ناک تاریکی کا راج
پست فطرت لومڑی کو شیر دیتا ہے خراج
ہیں یہاں بوجہل کے خدام میں شامل رسول
مطمئن مکروہ کانٹے، مضطرب خوش رنگ پھول

نازفرما ہیں ببولیں، اشک افشاں ہیں گلاب
ٹین کے ٹکڑوں کو سجدے کر رہے ہیں آفتاب
زشت رو مہلوں کی خوشامد کر رہے ہیں سیم بر
کتنے ابراہیم ہیں فرعون کے زیرِ اثر
سرنگوں ہے جھیل کے آگے سمندر کا علم
کانپتے ہیں ریت کے ٹیلوں سے الوندؔ و اضمؔ
ہیں بساطِ خاک پر غلطیدہ کتنے کوہِ نورؔ
حد سے بڑھتا جا رہا ہے سنگ پاروں کا غرور
مجھ کو حیرت ہے بہ ایں ضوباریٔ خورشید و ماہ
تیری دنیا کس قدر تاریک ہے بارِ الٰہ!
طاقتِ ظلمت رہائی دے نہیں سکتا مجھے
تو اندھیرے سے رہائی دے نہیں سکتا مجھے
عرش سے تو فرشِ خاکی پر اُتر سکتا نہیں
آدمی کی بے بسی محسوس کر سکتا نہیں!

مرحلے

ہو گئے کس قدر چمن تاراج
رات لیتی رہی سحر سے خراج

تا کجا آرزوئے بادہ و ساز
دیکھ صیّادِ وقت کا انداز

تا کجا عشرتِ غزل خوانی
دیکھ یہ آنسوؤں کی طغیانی

پھر فروزاں ہے آتشِ نمرود
زندگی ہے نہ زندگی کا سرود

دیکھ یہ شعلہ زارِ دیر و حرم
لہلہاتا ہے موت کا پرچم

دیکھ یہ شور گاہِ دار و رسن
ہر قدم پر حیات کا مدفن

بجلیاں ہیں شرر فشاں کیا کیا
اس زمیں پر ہیں آسماں کیا کیا

خون بہتا ہے شاہراہوں پر
جم گیا ہے لہو نگاہوں پر

کیا اندھیرا ہے انقلابوں کا
اُڑ گیا رنگ آفتابوں کا

آدمی اب خدا سے ہے مایوس
ٹمٹماتے ہیں زیست کے فانوس

دام افگن ہیں زلزلے کتنے!
ہیں ابھی اور مرحلے کتنے!

انتباہ

اے امیرِ رنگ و نور! اے خالقِ شام و سحر
اک نظر اس بزمِ احرام و اذاں پر اک نظر
دل یہاں سویا ہوا ہے کارفرما ہے شکم
جلوہ گر ہیں صوفیوں کی آستینوں میں صنم
بے حسی کے نام لیوا، عیش و عشرت ہیں اسیر
ہر ارادت مند کہتا ہے انھیں روشن ضمیر
صرصرِ عصیاں سے برہم داڑھیوں کا بال بال
رات دن رہتا ہے ان کے دل میں حوروں کا خیال
گیسوؤں سے جھانکتی ہیں رُوح کی تاریکیاں
ابنِ آدم اور رنگِ ابنِ آدم! الاماں
اِن کو حاصل ہیں یہیں خلدِ بریں کی رونقیں
سادہ لوحوں سے دعا کی فیس ملتی ہے انھیں

بارہا تیرے مقدّس نام سے کھیلے ہیں یہ
جانتا ہوں میں اِنھیں، ابلیس کے چیلے ہیں یہ
روز ان کی خلوتوں میں گردشِ جام و سبو
برملا پیتے ہیں یہ اپنے مریدوں کا لہو
خال و خط سے قبر کی مسموم راتیں آشکار
شہد کی نہروں پہ ہے ان کی عبادت کا مدار
پُرفسوں تسبیح خوانی، سحرزا وردِ درود
ہے مرے نزدیک زخمِ کائنات ان کا وجود
اِن کی پیشانی پہ لہراتے ہیں خودکامی کے ناگ
اِن کی آنکھوں میں شرار افشاں ریاکاری کی آگ
دشمنِ صدق و صفا، سرگشتۂ کفر و یقیں
آہ یہ ناآشنائے رحمۃ اللعالمین ؐ
رکھ چکے ہیں یہ ترے احکام کو بالائے طاق
یہ اُڑا سکتے ہیں سرکارِ دو عالم کا مذاق

منبروں پر یہ لئے بیٹھے ہیں باصد احتشام
سرد ئ فطرت سے کجلایا ہوا علمِ کلام
پے بہ پے دیتے رہے دھوکے غریب انسان کو
ایک بازیچہ بنا ڈالا ترے قرآن کو
ہر نفس روکارِ صرصر، ہر نظر عصمت شکار
چھین لے ان کا تقدّس ورنہ اے پروردگار
ظلمتِ اوہام سے دنیا کو بھر دیں گے یہ لوگ
خانقاہوں میں ترا نیلام کر دیں گے یہ لوگ!

نئی زندگی

بساطِ خاک پہ ہے زلزلوں کی مُہرِ جلال
شفق کے خون سے گلنار آسمان کی جبیں
نئی بہار کی تمہید ہے یہ شامِ خزاں
مہ و نجوم کو آواز دے رہی ہے زمیں

بھٹک رہی ہے خلاؤں میں رُوحِ کون و مکاں
نہ لطفِ دید، نہ دردِ جگر، نہ سوزِ دماغ
پکارتے ہیں دُھندلکے نئے اُجالوں کو
حریمِ فطرتِ کبریٰ میں جل رہے ہیں چراغ

ابھی سوادِ چمن ہے خموش و تیرہ و تار
کہ ظلمتوں میں ہے کھوئی ہوئی صباحِ چمن
جگا رہی ہے نسیمِ سحر شگوفوں کو
سمٹ رہے ہیں بلا خیز ظلمتوں کے کفن

کنارِ غم میں ابھی محوِ خواب ہے آدم
ابھی ہوائے گل افشاں پہ خندہ زن ہے سموم
حدیثِ عصمت و ایماں سنا رہی ہے حیات
سیاہیوں کے جلو میں ہے روشنی کا ہجوم

یہ پا شکستہ مسافر، یہ شعلہ گوں راہیں
ہر ایک موڑ پہ آتش کدے ہیں نفرت کے
تڑپ رہی ہیں جو چنگاریاں فضاؤں میں
یہ سرخ پھول ہیں گلخانۂ محبت کے

تمام سطوتِ شاہنشہی ہے نقش بر آب
نہ پوچھ کتنے تلاطم ہیں اس سفینے میں
ہوئی ہے خواب سے بیدار عظمتِ جمہور
جلالِ آتش و آہن ہے آبگینے میں

سُنائے کون خسم و ساتگیں کے افسانے
کہ مے کشوں سے گریزاں ہے ساقیِ کم سن
بہر نفس ہے شرر کار ایک محشرِ نو
بہر قدم ہیں امیدوں کی تربتیں۔ لیکن
یہ تربتیں ہیں نئی زندگی کے گہوارے
لرز رہے ہیں طلوعِ حیات سے تارے!

تلاطم

عصمتِ ادراک لرزاں مضمحل ذوقِ نمود

یہ طلسمِ دوش و فردا، یہ فریبِ ہست و بود

یہ زمیں، یہ آسماں، یہ گردشِ لیل و نہار

مرکزِ سیلاب و صرصر، محورِ برق و شرار

خود نسیمِ صبح خونِ آرزو برفا گئی

سیکڑوں نوخیز کلیوں کو خزاں یاد آ گئی

گنگناتی رقص فرماتی رہی بادِ سموم

منتشر ہوتے گئے رنگین غنچوں کے ہجوم

چار سو طاری رہی اک بیکراں نفرت کی رات

واہمہ بنتا رہا اکثر خدائے کائنات

اشتیاقِ دید پر قابض رہے کتنے حجاب

کس قدر دوزخ کے خدشے، کس قدر جنت کے خواب

کتنے راہی وادیِ تشکیک میں گم ہیں ابھی
نامکمل کفر و ایماں کے تلاطم ہیں ابھی
آہ یہ جھوٹے پیمبر، آہ یہ کاذب رسول
یہ مصائب کا تسلسل، یہ حوادث کا نزول
جھلملاتے رہ گئے فارانؔ و ایمنؔ کے چراغ
نورِ دل گھٹتا رہا، بڑھتا رہا سوزِ دماغ
ہر طرف شدّادؔ ہیں، قارونؔ ہیں، نمرودؔ ہیں
زندگی کے خوشنما گیسو غبار آلود ہیں
کاتبِ تقدیر کی مشقِ ستم جاری رہی
کشمکش ما بینِ ہستی و عدم جاری رہی
ظلمتوں میں برق پاروں کا تبسّم کھو گیا
آس کا نغمہ، اُمیدوں کا ترنّم کھو گیا
دانش و حکمت کے جوہر خون میں گھلتے رہے
آنسوؤں سے مرمریں آذر کدے دھلتے رہے

جذبۂ تخریب کام آتا رہا تعمیر میں
ذہن و دل جکڑے لیے ہے احساس کی زنجیر میں

دے رہا ہے عشق صدیوں سے مشیت کو خراج
مجھ کو ڈر ہے دردِ انساں ہو نہ جائے لاعلاج

جادۂ ظلمات پر ہیں کتنے تارے گام زن
اُف یہ تاریکی ہے کتنے آفتابوں کا کفن

یہ حباب آسا بہاریں، یہ سراب آسا حیات
آدمی کو مل نہیں سکتی "اندھیرے" سے نجات!

ماتم

بزمِ ہستی سے گریزاں ہو رہی ہے موجِ نور

تیرگی کی زد میں ہے اب آفتابوں کا غرور

اب وہ قندیلِ تصور ہے نہ وہ شمعِ خیال

روز افزوں ہو چلا ہے کبریائی کا جلال

قوت و دولت کے نوحے چھا گئے ادراک پر

ناامیدی شعلہ زن ہے اب دلِ غمناک پر

موت کی آغوش میں اک اک شگوفہ سو گیا

سوزِ فطرت آگ کے طوفان میں گم ہو گیا

وحشتِ عصیاں کی رو میں آدمیت بہہ گئی

داستانِ عشق و مستی نامکمل رہ گئی

سینۂ گل میں نظر آیا ہے پتھر کا جگر

قالبِ ظلمات میں ڈھلتے رہے شمس و قمر

کھو گئے تاریکیوں میں کس قدر مہرِ منیر
زندگی کب تک رہے شعلوں کے چنگل میں اسیر
آج بھی روئے حقیقت ہے نقاب اندر نقاب
یہ قدامت کی چٹانیں، یہ قیادت کے سراب
آدمی روتا رہا، ابلیسیت گاتی رہی
نغمہ زار دل پر مشیت زہر برساتی رہی
اب نہ وہ زلفوں کی خوشبو ہے نہ ہاتھوں کی شفق
زلزلوں میں اُڑ گئے طور و ہمالہ کے ورق
کیوں نہیں ملتا دلِ مضطر کو پیغامِ شکیب
تا بہ کے یہ شہریاری و خدائی کے فریب
اُف یہ شیدایانِ وحدت، آہ یہ زنّار پوش
متّصل بڑھتا گیا عقل و سیاست کا خروش
حسرتوں کو بے بسی کی ناگنیں ڈستی رہیں
آستانِ جہل پر ہے کن رسولوں کی جبیں

برگِ گل پر اوس کی اک بوند بھی گزری ہے شاق
انبیاء نے خود اڑایا ہے رسالت کا مذاق
یاس روحِ آرزو ہے، بے کسی جانِ حیات
خون کے چھینٹوں سے ہے رنگین دامانِ حیات
گو فلک آتش فشاں ہے نوحہ خواں اہلِ زمیں
اب مری آنکھوں میں افسر ایک آنسو بھی نہیں
نوعِ انساں کی زبوں حالی کا ماتم ہو چکا
اب مرا شیرازۂ احساس برہم ہو چکا!

تکونا دیس

یہ ستاروں کا تنفس، یہ اجل کی آہٹیں

یہ عروسِ زندگی کی خون آلودہ لٹیں

آج پھر تقدیر ہے محشر بکف طوفاں بدوش

کس قدر خورشید ہیں تابش نما ظلمت فروش

کتنے غنچے بے بسی کی داستانیں کہہ گئے

چاندنی کے زمزمے خاموش ہو کر رہ گئے

ظلمتیں کن ماہپاروں کا لہو برما گئیں

خرمنِ ہستی پہ کیا کیا بجلیاں لہرا گئیں

جوہرِ انسانیت کے کتنے ڈاکو ہیں یہاں

کس قدر ابنائے قارون و ہلاکو ہیں یہاں

اب زمامِ رہبری ہے رہزنوں کے ہاتھ میں
چھپ گیا ہے نورِ فاراں وقت کے ظلمات میں
جل رہا ہے لعل و گوہر کے چراغوں میں لہو
کر رہی ہے رات خونِ ماہ و انجم سے وضو
اب کہاں وہ رنگ و بو اس عالمِ ایجاد میں
ہیں ابھی چنگاریاں خاکسترِ شدّاد میں
آدمی کس جادۂ پُرہول پر ہے گام زن
جعفر و چنگیز نے بدلے ہیں کیا کیا پیرہن
آدمی کے حق میں کانٹے بو رہا ہے آدمی
آدمیت رو رہی ہے سو رہا ہے آدمی
پل رہی ہیں دوزخیں ان کی ہر اک پھنکار میں
کتنے اندھے سانپ ہیں اس وادیِ خونبار میں
امن و عرفاں دم بخود ہیں، قلبِ گیتی پر خروش
گاہ شورِ بے نوائی، گاہ فریادِ خموش

دشمنی کے راستے پر دوستی چلتی ہوئی

ہر قدم پر تیرگی کی مشعلیں جلتی ہوئی

آگیا مریخ کی زد میں غرورِ کائنات

یہ سیاہی اور یہ دم توڑتی شمعِ حیات

زہر میں ڈوبا ہوا گزرا ہے ابرِ نوبہار

خاک میں ملتے رہے کن عفتوں کے شاہکار

دین و دولت کا اندھیرا بیکراں ہوتا رہا

کس ظلمتاں میں سورج روشنی کھوتا رہا

ہائے یہ اہرام کا دل! یہ ہمالہ کا جگر!

کن حوادث کی نظر ہے اس تکونے دیس پر!

پرتو

یہ سلگتے ہوئے احساس، یہ مجروح سحر
پھر وہی رات، وہی مرثیۂ فکر و نظر
وہی بے چارگیٔ شوق، وہی دردِ حیات
زندگی پا نہ سکی "سوزِ غلامی" سے نجات
طور رگاتے ہیں اندھیرے کے سہارے کیا کیا
کس کو معلوم کہ ٹوٹے ہیں ستارے کیا کیا
ہیں ابھی دامنِ ہستی پہ وہی خون کے داغ
وہی نفرت کے دھندلکے، وہی سونے کے چراغ
کتنے ماتھوں پہ اُبھر آئے ہیں سجدوں کے نشان
ہائے یہ محنتِ برباد کے روشن اعلان
اک طرف تاجِ گراں، اک طرف اندوہِ کثیر
کتنے طوفان ہیں شکستہ سفینوں میں اسیر

اک طرف خاک بھی سیلاب گر و کوہ طراز
اک طرف بزمِ نوا، کارگہِ ساغر و ساز
قالبِ نور میں ڈھلتی رہی ظلمت کیا کیا
چاند سورج سے اُبلتی رہی ظلمت کیا کیا
ہیں بہر گام یہاں سبحہ و زنّار کے دام
وہی مذہب کے جراثیم امارت کے جذام
صبحِ رنگیں پہ ہے اب تک اثرِ فتنۂ شب
انقلابوں کی ہوائیں ہیں ابھی مہر بلب
پھر وہی گردِ کدورت ہے وہی ابرِ ملال
آہ یہ آتش و آہن کے خداؤں کا جلال
ختم ہوتی ہی نہیں شورشِ پیکان و تبر
کن دماغوں پہ ہیں پھیلے ہوئے ابلیس کے پر
کن رسولوں پہ ہے ماحول کا خونیں پرتو
دیکھ اُٹھی وہ دلِ منبر و محراب سے لو

آہ یہ حکمت و الہام و خودی کے مدفن
خود مہ و شمس نے پہنا ہے سیاہی کا کفن
چھا گئے دیکھ وہ محلوں پہ دھوئیں کے بادل
وہ جھکا پرچم شاہی، وہ گرے رنگ محل
اُتر آیا ہے رگ و پے میں سم کفر و یقیں
وہ بھڑکتے ہوئے افلاک سے ٹکرائی زمیں
چاکِ گُل ہو نہ سکا موسمِ گل سے بھی رفو
پی گیا وقت کن آئینہ ضمیروں کا لہو!

فریبِ مجاز

دیارِ عشق میں نے کوئی غزنوی نہ ایاز
نگاہِ شوق نے مجھ کو کیا ہے محرمِ راز

تمام بزمِ بہاراں ہے قابلِ تصویر
بتا دیا گل و بلبل نے اختلاط کا راز

ہے سرد سرد ہوا میں شراب کی تاثیر
مجھے یہ ڈر ہے نہ ہو جائے تو بھی کفر نواز

تری نظر میں ہیں اب تک بتانِ عہدِ عتیق
عروسِ لالہ ہی گلشن میں ہے مری ہمراز

گلوں میں آگ لگا دی ہے میرے نغموں نے
مری متاعِ حیات اک نوائے شعلہ طراز

لگے ہیں باغ میں لعل و عقیق کے انبار
فضائے دشت میں طائر ہیں زمزمہ پرداز

مثالِ ماہِ درخشاں ہے یاسمیں کا لباس
بسانِ آئینہ حیراں ہے نرگسِ غماز
اگرچہ دہرِ کہن پر سکوت طاری ہے
چمن میں گونج رہی ہے ہزار کی آواز
خزاں کی شام ہے صبحِ بہار کا انجام
ضمیرِ لالہ میں پوشیدہ ہے ابھی یہ راز
شعاعِ مہر میں ہے ایک سحرِ نامعلوم
گلوں سے اوس کے قطرے ہیں محوِ راز و نیاز
لرز رہا ہے درختوں کا عکس پانی میں
یہ "آئینے" ہیں مگر آبجو ہے "آئینہ ساز"
بنفشہ زار میں شبنم کے قافلے اُترے
نگاہ دامنِ فطرت پہ پڑھ رہی ہے نماز
یہی خیالِ پریشاں ستا رہا ہے مجھے
کہیں یہ "خلدِ نظر" بھی نہ ہو فریبِ مجازا!!

طاقِ کسریٰ نے کہا

قافلہ منزلِ مقصود سے تھا دُور ابھی
کہتی تھی بانگِ جرس "اور ذرا دور ابھی"
مَیں ٹہلتا ہوا صحرا کی طرف جا نکلا
یعنی "بازیچۂ کسریٰ" کی طرف جا نکلا
چاند کی زرد شعاعیں تھیں عناں گیرِ حیات
مل گئی مجھ کو غمِ کاہشِ فردا سے نجات
تھی ابھی تک مئے باقی مرے پیمانے میں
محو تھا فطرتِ ہستی کے پری خانے میں
چار سو گیسوئے مریخ کا پھیلا ہوا جال
صید کر لیتا تھا اک لحظے میں شاہین خیال
روح کو چین نہ تھا قلب کو آرام نہ تھا
تھا کوئی پارۂ لرزاں دلِ ناکام نہ تھا

"طاقِ کسریٰ" کے مناروں نے کیا مجھ سے خطاب

تو جو چاہے تو اُلٹ دے رُخِ فطرت سے نقاب

تو نے ذرّوں کو بتائے ہیں رموزِ الوند

ڈال دے گردنِ اہرمن و یزداں میں کمند

تو سمجھتا ہے جسے بادۂ دوشیں کا خمار

اُس میں پوشیدہ چلے آتے ہیں قوموں کے مزار

کیا مری عظمتِ رفتہ تجھے معلوم نہیں

کیا مری کیفیتِ رفتہ تجھے معلوم نہیں؟

چاند سورج کے جہاں تابِ دل افروز محل

رودِ کہسار میں بہتے ہوئے نورستہ کنول

اوس کا قطرۂ ناچیز، چراغِ مہِ نو

روزِ اول سے ہیں سب تیری خودی کے پیرو

کارفرما ہے خودی پردۂ زنگاری میں

شمعِ ایوانِ محبت کی ضیا باری میں

تازہ کاری سے عیاں گلشنِ جنت کی بہار

تازہ کاری میں نہاں عالمِ نو کے اسرار

کیا عجب، ہو تپشِ خونِ رگِ کوہ و دمن
ارضِ مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کی کرن
سینۂ لالہ صدف ہے گہرِ شبنم کا
جس طرح خاک بھی اک جزو ہے جامِ جم کا
قلبِ فطرت میں بناتا ہے نشیمن اپنا
جس کو دیتی ہے خودی شعلۂ روشن اپنا
وہ طلسماتِ منظم ہے ضمیرِ تقدیر
کہتے ہیں اہلِ نظر جس کو "طلائی زنجیر"
ہوگیا سوزِ کہن جب سے اساطیرِ فسوں
اور پائندہ ہوا قصرِ غلامی کا ستوں
کون کہتا ہے جہاں تودۂ خاشاک نہیں
زندگی موت ہے گر شعلۂ بیباک نہیں
یا یہ زنجیر ہی رہ بشکوۂ زنجیر نہ کر
یا مکافات کو تقدیر سے تعبیر نہ کر!

افرنگ زدگی

میں تجھ کو بلاتا ہوں سوئے عالمِ آزاد
لیکن تری تخئیل نہیں اس پہ رضامند
زندانِ کشاکش میں گرفتار رہے محکوم
یہ بندۂ مجبور نہ افسردہ و خورسند
خونریزیٔ توحید سے بیگانہ و بیزار
تاریکیٔ تثلیث کے مردانِ خردمند

(۲)

اس نکتۂ باریک کی مشکل نہیں تحلیل
تو شعلۂ نم خوردہ ہے یا بانگِ سرافیل
بے غیرت و بدنفس ہے بابائے فرنگی
رسواکنِ آدم صفتِ جذبۂ ہابیل
مے خانۂ افرنگ کی افسانہ گری چھوڑ
یہ آیت مہمل ہے نہ توریت نہ انجیل!

رات

نشاط انگیز ہے تاروں بھری رات
غلافِ گنبدِ نیلوفری رات
شعاعیں داغِ ظلمت دُھو رہی ہیں
ابھی معصوم کلیاں سو رہی ہیں
مہِ نَو جلوہ آرا ہے فلک پر
جھلکتا ہے زمیں پر "عکسِ کوثر"
زمانے بھر کی گردش رُک گئی ہے
جبینِ عشق و مستی جُھک گئی ہے
امنگوں کی جوانی ہیں یہ لمحے
سرورِ زندگانی ہیں یہ لمحے
سحر ہے چاند کے غاروں میں روپوش
ستارے قبر کی مانند خاموش
نہ نکلے کاش خورشیدِ سحر تاب
نہ اٹھیں پھر یہ مردانِ گراں خواب!

تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

زندگی کے موڑ پر کہتا تھا اک ننگا فقیر
ہوں گدائے بے نوا مرعوبِ سلطان و امیر
خوں رُلاتا ہے مجھے یہ انقلاب ایّام کا
بندۂ مومن نہیں اب ہمسرِ شاہ و وزیر
ختمِ میعادِ اسیری پر سکوں موقوف ہے
کیوں خودی کو بیچ دیتے ہیں قفس کے ہاتھ اسیر
اس کی خاکستر میں سوزِ آرزو باقی نہیں
سرد ہو کر رہ گیا، خونِ رگِ دہقانِ پیر
آہ یہ معصوم کلیساں اور فرشِ خاک پر!
میں سمجھتا تھا نسیمِ صبح کو روشن ضمیر
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر!

آوازِ غیب

تیری نادانی پہ کیا کیا مسکراتی ہے بہار
ڈھونڈتا ہے قطرۂ شبنم میں تو موجِ شرار
تیرگیٔ شامِ بے رنگِ خزاں کے منتظر
اُدھر اُس کا آئینہ خانہ، پھول کے نقش و نگار
بندۂ خود بیں کی تیغِ تیز کی جھنکار سے
لرزہ براندام رہتا ہے مزاجِ روزگار
جس کی کوشش سے ہے شمشیرِ سکندر سربلند
سامنے جس کے ہما آئے سرنگوں و شرمسار
اُس کے لب ہیں نغمہ سنجِ نعرۂ ہل من مزید
تیرے لب پر ورد "رب العالمین" "پروردگار"
بندۂ آزاد ہے سارے جہاں پر حکمراں
بندۂ محکوم کا سرمایہ چشمِ دجلہ بار
زندگی کیا ہے؟ فقط عزم و عمل کا نام ہے!
ہائے وہ انساں جسے تقدیر پر ہے اعتبار!

ارضِ تضاد

تیرگی جب توڑ دیتی ہے طلسمِ رنگ و آب
حجلۂ مغرب میں ہو جاتا ہے سُورج محوِ خواب
زاہد اپنی جنت گم گشتہ کرتا ہے تلاش
مے کدے میں بادہ کش ہوتا ہے جویائے شراب
قطرۂ شبنم لرزتا ہے کسی گل برگ پر
صبحدم جب رقص کرتی ہے شعاعِ آفتاب
ٹوٹ جاتی ہے دہانِ بحر کی مُہرِ سکوت
جب بجھا دیتی ہے بادِ تند فانوسِ حباب
حملہ آورِ کشورِ ہستی پہ جب ہوتی ہے موت
خود بخود ہوتا ہے روئے زندگانی بے حجاب

باغ میں ہوتی ہے پھر فصلِ بہاراں خیمہ زن

چھین لیتی ہے خزاں جب لالہ و گل کا شباب

آنسوؤں پر ہے یہاں موجِ تبسم کی اساس

نوحہ گر ہوتی ہے بلبل، مسکراتا ہے گلاب

عرصۂ افلاک سے ہوتی ہے شب محوِ گریز

شعلہ افشاں جب نظر آتی ہے تیغِ آفتاب

ضربتِ کردار سے بے دست و پا مزدور بھی

توڑ سکتا ہے غرورِ شوکتِ افراسیاب

خاک میں ضو ریز ہوتا ہے چراغِ کہکشاں

اُف وہ لمحے جب مشیت مجھ سے کرتی ہے خطاب

ہے تلون کیش فطرت میری نظروں میں اسیر

جلوہ آرا ہے مرے شعروں میں روحِ انقلاب!

حدیثِ اضطراب

کسی کو بزم جہاں میں سکوں نہیں ملتا
کہ بیقرار ہے بت ساز، بت شکن بیتاب
ہر ایک لمحہ ورودِ خزاں کا اندیشہ
تمام اہلِ چمن مضطرب، چمن بیتاب
اُدھر تُنکار تغافل ہے ساقیِ کم سن
صراحیوں میں اِدھر بادۂ کہن بیتاب
اُدھر ہے حرف وحکایت کی گرم بازاری
اِدھر سکوت میں ہے محشرِ سخن بیتاب
اُدھر ہے عطر فشاں کاکلِ شکن پرورہ
اِدھر یہ حال کہ ہر ایک موئے تن بیتاب

اُدھر ہے اوس کی بوندوں پہ موتیوں کا گماں

اِدھر یقین کہ سورج کی ہر کرن بیتاب

اُدھر گلاب کی نخوت سے بلبلیں بے چین

اِدھر نسیم کی شورش سے یاسمن بیتاب

اُدھر ہے شیخ چراغِ حرم سے شعلہ بہ پا

اِدھر بتوں کی خموشی سے برہمن بیتاب

اُدھر ہے پہلوئے خسرو میں نوحہ گر شیریں

اِدھر ہے فرقتِ شیریں میں کوہکن بیتاب

اُدھر ہے وحشتِ عصیاں سے پُرغضب یزداں

اِدھر جلالِ تقدس سے اہرمن بیتاب

چراغِ مہر فسوں کار صبح سے تا شام

تمام رات ستاروں کی انجمن بیتاب!

صبحِ آزادی کے خواب

ہو رہا ہے ذہن پر اوہامِ باطل کا نزول
اب دعائیں نارسا ہیں بند ہے بابِ قبول
طائرانِ خوش نوا پر خندہ زن ہیں بوم و زاغ
عرش پر اسکندر و چنگیز و نادر کا دماغ
خاک پر ٹوٹے پڑے ہیں انجم و خورشید و ماہ
اہرمن کی زیرِ نگرانی ہے تعمیرِ گناہ
تیز تر ہیں بجلیوں سے گردشیں ایام کی
اُڑ رہی ہیں دھجیاں سی جامۂ احرام کی
اب کہاں ہیں دہر میں ہنگامہ ہائے رنگ و صوت
زندگی کتنی گراں ہے کس قدر ارزاں ہے موت

وہ خدا جس نے بنائے ساغرِ جم، تخت کے
صاحبِ ثروت کو دیتا ہے شراب و چنگ و نے
بے کس و مجبور ہیں دامِ فلاکت میں اسیر
آہ یہ دربارِ سلطان و شبستانِ وزیر
آہ یہ خونخوار، یہ سرمایہ دارِ حیلہ گر
اس کے تہہ خانے ہیں اور دہقاں کی محنت کا ثمر
دیکھتا اے کاش وہ پروردگارِ بے نیاز
یہ پریشانی، یہ دردِ زندگی، یہ سوز و ساز
لیکن اے اخترؔ اُسے کیا واسطہ مظلوم سے
وہ تو محوِ خواب ہے اک مدّتِ معلوم سے

رقص کرتی ہے شعاعِ اوّلیں ہر پھول پر
غازۂ روئے سحر ہے اوس کا خونِ جگر

اوس کی بیچارگی تسلیم! لیکن ہمنشیں
کس کے پرتو سے فروزاں ہے ضمیرِ یاسمیں؟

پیکرِ تقلید میں پنہاں ہے رُوحِ اجتہاد
آدمِ نَو توڑ دے گا یہ طلسماتِ تضاد

گلشنِ تائید بھی ہے آتشِ تردید میں
اک بہارِ بے خزاں ہے معرضِ تولید میں

شبستاں مرکزِ تیغ و سلاسل ہے تو کیا
برقِ سوزندہ شرر باری پہ مائل ہے تو کیا

ہے ابھی صحنِ گلستاں شورشِ افزائے نمو
جل رہا ہے چشمِ نرگس میں چراغِ آرزو

بج رہی ہے ذرّے ذرّے میں نفیرِ انقلاب
تیرتے ہیں تیرگی میں صبحِ آزادی کے خواب!

فریبِ نظر

کس قدر دل سوز ہے افسردہ تابستاں کی رات
ہے کسی مضراب زن کا منتظر سازِ حیات
نیلگوں افلاک پر ہے ماہپاروں کا ہجوم
جگمگاتا ہے مہِ نو مسکراتے ہیں نجوم
اب کہاں وہ عالمِ ہستی کے اندازِ جنوں
کارفرما ہے جہاں میں ساحرِ شب کا فسوں
دُور سے آتی ہے اک مبہم صدائے دردناک
ہو فضا میں جیسے محوِ نالہ کوئی جانِ پاک
ہر ستارے پر مسلط اک سکوتِ دل گداز
ہو رہا ہے ظلمتِ رخشندہ سے راز و نیاز

ہیں صبا میں نرم موجیں بادۂ سرجوش کی

خامشی ہے پاسباں اس جنّتِ خاموش کی

ہے جمالِ حسن عکس افگن دلِ غمناک پر

لالۂ رخ حوریں زر افشاں ہیں بساطِ خاک پر

اُٹھ چکا ہے خود بخود سلمائے ماضی کا نقاب

مضمحل ہے ذرّہ ذرّہ، سرنگوں ہے ماہتاب

قلبِ مضطر میں نظر آتے ہیں آثارِ شکیب

ہمنشیں! فطرت نہ دیتی ہو کہیں مجھ کو فریب!

خارزار

تو کہاں ہے خدائے دیر و حرم
اپنی دنیا کا انتشار تو دیکھ
تیری جنت نظر فروز سہی
زندگی کا یہ خارزار تو دیکھ

اک طرف رنگ و بو کا سیلِ گراں
اک طرف دل میں درد لب پہ فغاں
اک طرف ہے بدن سے رُوح نفور
اک طرف اہتمامِ نکہت و نور
اک طرف ذرہ ذرہ "سیمابی"
اک طرف "کوکبی و مہتابی"
اک طرف خاک رو کشِ الماس
اک طرف سرد آتشِ احساس

اک طرف زر کی حکمرانی ہے
اک طرف مرگِ ناگہانی ہے
اک طرف زیست کی گراں باری
اک طرف شاہدانِ بازاری
اک طرف آب و رنگ و رقص و سرود
اک طرف راہِ زندگی مسدود
اک طرف عطر و گل کے نورِ نظر
اک طرف تربتوں کے لختِ جگر
اک طرف نیل و طور کے فرزند
اک طرف اشک و آہ کے دلبند
اک طرف بزم ماہ پاروں کی
اک طرف رات بے ستاروں کی
اک طرف رقص آفتابوں کا
اک طرف سلسلہ سرابوں کا

اک طرف گل فشانیِٔ ہستی
اک طرف نوحہ خوانیِٔ ہستی
اک طرف بے بسی کی خشک ببول
اک طرف نزہت و نمو کے رسول

تو کہاں ہے خدائے دیر و حرم　　اپنی دنیا کا انتشار تو دیکھ
تیری جنت نظر فروز سہی　　زندگی کا یہ خار زار تو دیکھ

انجم اور منجم

منجم

کیا چیز ہے سُرودِ رسائے کاوشِ مدام؟

کیوں دل کے واردات بدلتے ہیں صبح و شام؟

محکومیت کے فیض سے اے انجمِ سحر

میری خودی بھی خام ہے تیرا جنوں بھی خام

واقف نہیں میں "جامِ مسلسل" کے راز سے

آگاہ کر خرامِ مسلسل کے راز سے

انجم

فطرت ہے گرچہ روزِ ازل سے مری انیس

اکثر یہ سوچتا ہوں کہ آخر کہوں تو کیا

بیتابیاں ملی ہیں مجھے بھی بقدرِ ظرف
حاصل نہیں ہے مجھ کو فراغِ سکوں تو کیا

میرے بغیر تنگ ہے تخئیلِ راہگیر
ہوں نیل زارِ چرخ میں خوار و زبوں تو کیا

افسوس تیری خاک میں جوشِ نمو نہیں
چل جائے تجھ پہ شامِ خزاں کا فسوں تو کیا

بیتابیٔ حیات اُلٹتی ہے تختِ کے
بیتابیٔ حیات ہی اصلِ حیات ہے!